



فاتحہ رفتگار

خداوند کیلئے

کہیں اس پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے پیچھے کوئی تسخیر
تو نہیں؟ ہم دونوں کا مذاق تو نہیں اڑایا جا رہا۔
”کیا ہوا؟ آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟ پہلا بے بی ہے
تایہ آپ کا؟“ اس نے میری حیرت بلکہ بے پناہ حیرت کو

”آپ کی بیوی امید سے ہے، مبارک ہو۔“
لیڈی ڈاکٹر کے یہ الفاظ میرے لیے غیر متوقع تھے
میں الجھن بھرے انداز میں اس کی مسکراہٹ کھوجنے
لگا۔



مکمل ناول

نوٹ کر کے سوال کیا۔

”خوشی؟“ میں نے اس سے نہیں خود سے سوال کیا۔

”آپ کو پورا یقین ہے ڈاکٹر صاحبہ؟“

”یہ رپورٹس تو یہی کہہ رہی ہیں مسٹر رضا۔“ اس کی پیشہ ورانہ خوش خلقی ذرا خفیف سی ہو گئی، قدرے محنت لہجہ اپناتے ہوئے اس نے اگلے مریض کو اندر بلوانے کے لیے تیل بجا دی۔

”ضروری نہیں کہ ہر بار ہر خاتون کے ساتھ ایک جیسی علامات نمایاں ہوں۔ آپ کی مسز خاصی کمزور

ہیں۔ نارمل حالات میں شاید ان کی علامات بھی نارمل ہوتیں یعنی متلی، چکر آنا وغیرہ۔ لیکن ایک تو یہ اینیمک ہیں ان میں ہیملو گلوبن بہت کم ہے دوسرا ان کا بی پی بے بی کنسیو کرتے ہی خطرناک حد تک لورنے لگا ہے اس لیے ریگینسی کی نارمل علامات پہ ان کی کمزوری غالب آگئی۔ یہ کچھ وٹامنز لکھ دیے ہیں میں نے۔۔۔۔۔ ان کا باقاعدگی سے استعمال کرائیے۔ غذا کا خاص خیال رکھئے، پھل، دودھ اور جوس وغیرہ روزانہ کی خوراک میں شامل رکھیں، آرام کا دھیان رکھئے اور انہیں زیادہ سے زیادہ ذہنی سکون دینے کی

موشن کریں۔ اس نے ایک ہی سانس میں کئی
اصطلاحی تدابیر گنوا دیں۔

”اور آپ بی بی! اب کے وہ میرے برابر میں بیٹھی
زینب کی جانب متوجہ ہوئی تو مجھے بھی اس کی موجودگی
کا احساس ہوا۔ میں نے گردن موڑ کے اسے دیکھنا
چاہا۔ سیاہ چادر کے ہالے میں کئی ہوئی، کچھ گھبرائی،
زیادہ شرمائی سی زینب میری بہ نسبت نہ تو حیران تھی نہ
ریشان، میرے لیے تو یہ خبر اچانک اور غیر متوقع بھی
لیکن شاید اسے کچھ اندازہ تھا اپنی بدلتی حالت کا۔
اسی لیے تو خود زور دے کر مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس
چلنے کو کہا تھا۔ میں تب بھی اس کا مقصد نہ سمجھا ہاں
البتہ اس بات پر حیرت ضرور ہوئی تھی کہ کسی تکلیف
اور بیماری کو خاطر میں نہ لانے والی زینب خود ڈاکٹر کے
پاس جانے کا کہہ رہی ہے ورنہ شدید فلو، تیز بخار یا گلے
کے انفیکشن میں بھی وہ بجائے ڈاکٹر کے پاس جانے کے
گھریلو ٹونکوں اور جوشاندے وغیرہ سے کام چلایا کرتی
اور اب صرف تھکن، چکر آنے اور دل گھبرانے جیسی
علامات سے گھبرا کر ڈاکٹر کے پاس جانے کا کہہ رہی

شاید میں کچھ اور دن ٹالتا رہتا مگر کل جب وہ کپڑے
استری کرتے کرتے اچانک بے ہوش ہو کر گر پڑی تو
مجھے اسے یہاں لانا ہی پڑا اور جب ڈاکٹر نے کئی ایک
ٹیسٹ ایک ساتھ لکھ کر دیے تو مجھے بھی تشویش سی
ہوئی کہ اسے ایسی کیا بیماری لگ گئی اور آج ان ٹیسٹوں
کی رپورٹ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس پہ میں سن کے
بھی یقین نہ کر پا رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر زینب کے چہرے کو کھوجا۔
وہ بہت مطمئن، شاد سی لگ رہی تھی۔ خوشی سے
دکتے چہرے کے ساتھ وہ سر ہلایا کے ڈاکٹر کی ہدایات
سن رہی تھی۔

”اس وقت جسے سب سے زیادہ تمہارا خیال رکھنا
چاہیے وہ تم خود ہو زینب کم از کم یہ پہلے تین مہینے
تمہارے لیے حد سے زیادہ محتاط ہو کر گزارنے والے

دن ہرپ نہ دو اکانا نہ ہونہ غذا ملی تھی۔ اس کا ہاں نہ
چاہے تھیں دن میں کم از کم چار پانچ بار خوراک لینا
ہے۔ ضروری نہیں کہ بھاری اور اقل غذا کھانا
جائے۔ روتی، سالن کے بجائے زیادہ زور زور ہضم کر
طاقت بخش غذا پہ دو۔ پھل کھاؤ یا جوس ہو، رات
سونے سے قبل دو گھنٹے ضرور اونٹاٹ میں ایسے آئندہ فیروز
لو۔ ایک وقت گوشت بھی کھاؤ آرام کا، حیمان رکھنا۔
سیڑھیاں چڑھنا اترنا بھاری سالن اٹھانا پانی میں زیادہ
جاننا یہ سب بالکل ترک کر دو، ٹھیک ہے؟“

اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔ حالانکہ اسے
امید کم تھی۔ کھانے پینے سے اس کی جان جاتی تھی۔
تو اس کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا۔
اکلی مریضہ اندر آچکی تھی میں نے فیس نہیں
رکھی اور زینب کو لے کر باہر نکل آیا۔



میں سهام رضا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد زینب
ہوں۔ چار بہنوں کا چھوٹا، اکلوتا اور لاڈلا بھالی۔

یوں تو ہمارے معاشرے میں اولاد زینب کو دیے بھی
کافی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ٹڈل کلاس میں شاید اس
کی اہمیت زندگی اور موت سے بھی بڑھ جاتی ہے۔
میرے والدین کا تعلق بھی لوئر ٹڈل کلاس سے تھا۔ ابو
جی کا چھوٹا موٹا جنرل اسٹور تھا، ایک درمیانے درجے
کے محلے میں مختصر سا اپنا ذاتی مکان بھی تھا۔ وہ معتمد
تعلیم یافتہ تھے۔ جبکہ میری سیدھی سادی گاؤں سے
تعلق رکھنے والی امی اتنا بھی پڑھ نہ پائی تھیں۔ ان کی
زندگی کا محور ان کا گھر، شوہر، اولاد اور ان سے متعلقہ
مسائل کے گرد گھومتا تھا۔ ان مسائل میں کے بعد
دیگرے لڑکیوں کی پیدائش اور سسرال والوں کے طعنے
بھی شامل تھے۔ اسی طرح ابو کی زندگی کا محور تھا ان کا
اسٹور، اس کی کبھی بڑھتی اور کبھی گھٹتی آمدنی، گھریلو
اخراجات، بیوی اور گھر والوں کے درمیان مفاہمت
کراتے رہنے کی مسلسل مگر کافی کوششیں اور دنوں

اپنے اس مخصوص محور میں ایک مشترکہ خواہش
لے جی رہے تھے اور یہ خواہش بھی بیٹے کی۔

اس خواہش کی تکمیل میں امی نے اوپر تلے چہرے
پیشیاں پیدا کیں بہن میں سے دو تو چند مہینے بھی نہ جی
ہائیں البتہ باقی چار فالٹہ 'مریم' خدیجہ اور صالحہ ماں
باپ کی اس خواہش میں اپنا اپنا کردار ادا کرنے کے لیے
موجود رہیں۔ اب وہ بھالی کے انتظار میں شامل تھیں۔
بارہ سال کے انتظار کے بعد میں ان کے آنگن میں

آیا میرا تو جو بھی استقبال ہوتا وہ کم تھا۔ ابو جی نے اس
خوشی میں اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کیا۔ پوری
برادری اور محلے میں خالص دہی گھی کے لڈو بلیٹ بھر
بھر کے بانٹے گئے۔ امی جی نے دانی کو اپنا سونے کا کڑا
انار کے دے دیا جو انہیں کم عزیز نہ تھا۔ سونے سے
دیے بھی عورت کو محبت ہوتی ہے اور نچلے طبقے کی وہ
عورت جس نے سونا بنانے کے لیے کئی سال گھریلو
بجٹ میں کٹوتیاں کی ہوں، کیٹیاں ڈالی ہوں۔ یہ
فراخدا ان کی بے پایاں مسرت کا والہانہ اظہار تھی۔
میری دادی جو پورے خاندان میں کنجوس مشہور تھیں
انہوں نے برسہا برس سے لوہے کے بڑے ٹرنک میں
سنجھالے قیمتی ریشمی سوٹ ساری بیٹیوں اور بہوؤں
میں مارے خوشی کے تقسیم کر دیے اور تو اور جب سوا
بنتے بعد میرا عقیدہ ہوا تو باقاعدہ ڈھولک رکھی گئی۔ دور
پڑے کے سارے رشتے دار مدعو کیے گئے۔ پلاؤ، زردہ
اور قورمہ کی دیکھیں پکائی گئیں، یہ سب ظاہر ہے کہ
میری یادداشت کا حصہ نہیں۔ ہاں یہ دادی سے سنے
ہوئے یہ قہقہے ہیں جو اب تک ذہن میں زندہ ہیں۔ اس
یادگار عقیقت کی تمام تفصیلات وہ اکثر مجھے گود میں بٹھا
کے سناتی تھیں، جب تک وہ زندہ رہیں۔

"تیری چھوٹی چھوٹی چاہتی ویسے تو تیری ماں سے کبھی
نہیں بنی اس کی لیکن تیرے عقیقتے۔ اپنے ہاتھ سے
ہو کیڈ کی چھلکی شہری شہروانی اور ٹوپی سی کے لائی،
بڑے شوق سے تجھے پہنایا۔

تیری ماسی کوثر۔ تب وہاں ہی نہیں گئی تھی بڑی

شونہ ہوتی تھی۔ لک (گھر) پہ دپٹہ باندھ کے تاپتی تھی
ڈھولک۔ وہیں میری پھیری بہن نے اسے اپنے
منڈتے کے لیے پسند کیا تھا۔ اتنا کر موم والا ثابت ہوا
تھا تو اپنے ہاتھوں (نہیال) کے لیے خوش تو تیری مانی
بھی بڑی تھی۔ تیری مانی نے اس دن چینی بے عزتی
کر دالی میرے ہاتھوں۔ منہ پکا کر کے کہنے لگی۔

"ہائے" یہ منڈا تو۔ مسرت ماما (سات مہینے) گدتا
سے نہ ہلدی نہ بولی۔ "بھٹے تو لگ گئی آگ چار کنڑوی
باتیں ضرور سنائیں۔ وہ ہوتی کون تھی۔"

لیکن اس وقت اپنے کنڑو، نازک سے پوتے کو
آنکھوں سے لگا لگا کے چومنے والی میری دادی کو بھی
جلد ہی میری صحت کے بارے میں تشویش رہنے لگی۔
کبھی وہ میری ماں پہ بگڑتی۔

"ہمارا دادی کا دودھ ہے کہ پانی کچھ لگتا ہی نہیں اڑ کے کو،
چھ مہینے کا ہو گیا ہے۔ گود میں پڑا جھلے کا بچہ ہی لگتا ہے۔
توبہ ہاتھ میں کیتے ڈر لگتا ہے پتلی سے پتلی ٹانگیں اور
بازو۔"

وہ نجانے کون سے حکیموں اور دایوں سے رنگ
برنگے تیل لاکے میری ٹانگوں اور سینے کی مالش کرتیں۔
کبھی ابو سے تشویش کا اظہار کیا جاتا۔

"کس نے کہا تھا۔ شیخی مارنے کو، اللہ نے کرم کیا تھا تو
اللہ کا ہی شکرانہ ادا کر لیتے یوں سارا شہرا کٹھا کرنے کی
کیا ضرورت تھی۔ لوگ تو کھاپی کے ڈکار لینے والے
ہوتے ہیں۔ کوئی شہدہ نظر لگا گیا ہے۔ دیکھ تو اس عمر
میں بچے بیٹھنا شروع کر دیتے ہیں یہ نما ناگردن تک
سیدھی نہیں رکھ سکتا۔"

میں نے اپنی ابتدائی عمر کی تصاویر بھی دیکھی ہیں۔
واقعی ان کی تشویش بجا تھی۔ ان تصاویر میں موجود
باشت بھر کے سات آٹھ مہینے کے بچے کو دیکھ کے میں
خود ڈر گیا تھا جس کے مختصر سے وجود۔ صرف آنکھیں
نمایاں تھیں۔ میں نے اپنی پہلی سالگرہ کی تصویر بھی
دیکھی تھی جس میں میں بڑا خوب صورت بابا سوت
پننے امی اور ابو کے درمیان دادی کی گود میں بیٹھا ہوں۔

اس میں بھی میں بمشکل چند ماہ کا لگ رہا تھا۔ اور پھر اس کے بعد آنے والی سالگرہوں کی تصاویر، ہر تصویر میں سالانہ باجی، خدیجہ باجی، مریم اور فاطمہ جیسے ایک سال میں کئی برسوں کی جست لگا کے آگے پہنچی ہوتی تھیں اور میں نجانے کس طرح رنگ کے ایک سال گزارتا۔

اور یہ میری پانچویں سالگرہ کی تصویر۔ کسی دو ڈھائی سال کے بچے کے برابر میں ایک بار پھر دادی کی گود میں تھا۔ یہ دادی کے ساتھ میری آخری تصویر تھی۔ میری چھٹی سالگرہ سے پہلے وہ گزر گئیں۔ میری صحت اور افزائش کے متعلق اپنی ساری فکریں ساری تدابیر میری ماں کو سونپ کے۔ باجیوں کو کونے اب دادی کے بجائے امی دینے لگیں۔

”نامرادیں تری کی نیل کی طرح بڑھتی جا رہی ہیں۔ باپ کا سارا رزق ان ہی پہ اٹھ رہا ہے۔ جہاں لڑکیاں اتنی پھلنے پھولنے والی ہوں وہاں لڑکے سوکھ کے کانٹا بنتے جاتے ہیں“ اللہ بخشے بے بے ٹھیک کہتی تھی۔“

اب اس تشویش کا اظہار ماں کے علاوہ اور رشتے دار عورتوں اور آس پڑوس کی جانب سے بھی ہونے لگا۔ طرح طرح کے مشوروں سے نوازا جاتا۔ کئی قسم کے ٹوٹکے بتائے جاتے۔ کسی بزرگ عورت کی تحقیق کے مطابق میں ”سوکھے“ کا شکار تھا یا غلطی سے کسی نے مجھے جھاڑو سے چھو دیا تھا اس کے سبب باب کے لیے میرے ابو کو بلاناغہ منہ اندھیرے مسجد میں جھاڑو دینے کا مشورہ دیا گیا۔ کسی دور پرے کی نانی کے خیال میں میں نظیر کا شکار تھا، فلاں بیری کی دھولی سے ٹھیک ہو سکتا تھا۔ کوئی معقول خاتون کسی اچھے معالج سے معائنے کا مشورہ بھی دیتی۔

میں اب نارمل نہیں تھا کم از کم ذہنی طور پر۔ بلکہ وہ کھاجا جائے تو جسمانی طور پر بھی اللہ کے فضل سے کوئی عیب نہیں تھا۔ میری نظر ٹھیک تھی۔ عام بچوں کی بہ نسبت دیر سے بولنا شروع کیا، اٹک اٹک کے بولنا سیکھا۔ لیکن اب پانچ چھ سال کی عمر تک روانی سے اور

صاف لہجے میں بولنا سیکھ چکا تھا۔ تقریباً دو سال کی عمر کے بعد یہاں اقدیم اٹھایا مگر میری کمزور سوکھی نالیوں کا شکار نہیں تھیں اب میں نہ صرف چل سکتا تھا بلکہ دوسرے بچوں کے ساتھ بھاگ دوڑ کے کھیل بھی سکتا تھا۔ یہ مالی لحاظ سے میں کچھ ست روی کا شکار ضرور تھا یعنی نارمل بچوں کی نسبت میں نے ہر کام دیر سے شروع کیا۔

یہی وجہ ہے کہ پانچ سال کی عمر میں ابو نے مجھے اسکول میں داخل کرنے کا ارادہ کیا۔ اب میں ان کی گود سے دور۔۔۔ بہنوں کے لاڈ سے نکل کر ایک نئی دنیا میں جانے کے لیے پرتول رہا تھا۔ خود آگہی کی جانب پہلا قدم۔۔۔ اور پھر آنے والا سال مجھے خود سے شناسا ہونے کا بھرپور موقع دینے لگا۔ بھرپور اور سفاک موقع۔



وہ میری زندگی کا چھٹا سال تھا۔ پچھلے سال جب ابو مجھے اسکول میں داخل کرانا چاہتے تھے تو اس فیصلے کی سب سے زیادہ مخالفت دادی نے کی تھی۔ انھوں نے چچا اور پھوپھیوں کو بلا کے باقاعدہ پنچایت بٹھالی تھی اور رو رو کے واویلا کیا تھا کہ مجھ پہ۔۔۔ یعنی ان کے معصوم بے چارے پوتے پہ کیا ظلم ہونے جا رہا ہے۔ یوں میرا اسکول جانا ٹل گیا۔ دادی کے گزرنے کے بعد اور میری چھٹی سالگرہ کے اگلے مہینے ابو مجھے علاقے کے نزدیکی پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکول میں لے گئے۔ ہرٹل کلاس کے شخص کی طرح انہوں نے بھی اپنی اولاد کے لیے کچھ خواب دیکھ رکھے تھے۔ بڑے اونچے بڑے اعلا خواب۔ اور اولاد بھی پھر وہ اکلوتی، زرینہ اولاد۔ ابو نے مجھے اعلا تعلیم دلا کے بڑا افسر ڈاکٹریا وکیل بنانے کا خواب دیکھ رکھا تھا۔ خود ان کی ساری زندگی کرپانے کی دکان میں دالیں، مسالے اور کھی تول تول کے گزر گئی تھی انہوں نے تو بیٹیوں کو بھی پڑھایا تھا۔

”زسری میں چھ سال کا بچہ؟ ہم زسری میں نمنا

جب سے ہوش سنبھالا باجیوں اور ماں کی ہاتھوں میں بنا بنا کے اپنے پیچھے بھاگتے دیکھا مجھے کھانے پینے والی ہر چیز سے ہزاری سی ہو گئی تھی۔ لیکن اب میں نے گھبرا کے امی کی باتوں کو سنجیدگی سے لینا شروع کر دیا۔

ان کا کہنا تھا کہ کلہی کھانے سے خون بنتا ہے اسی لیے وہ گوشت بھونتے ہوئے گرم گرم کلہی جیسے زبردستی کھلایا کرتیں۔ پہلے میں رو دھو کے ایک آدھ نوالہ لیا کرتا، اب چاہے کلہی میرے حلق میں پھنستی جاتی، مگر میں نیا خون بنانے کے شوق میں چبائے جاتا، نکلنے کی کوشش کیے جاتا۔

دودھ دیکھتے ہی میرا موڈ آف ہو جاتا تھا، اب طوبیٰ و کرہا میں رات کو دودھ بھی پینے لگا۔

پھل میں مجھے صرف آم بھاتے تھے جو ظاہر ہے سارا سال تو نہیں ہوتے تھے لیکن اب میں امی کے کاٹ کر دیے گئے ہر پھل کو کھانے کی کوشش کرتا۔ ابو نے رسی کوونے کے لیے رسہ لا کر دیا، لٹکنے کے لیے بھی برآمدے میں جنگلا لگوایا کہ شاید لٹکنے سے نڈ لسا ہو جائے۔ لیکن فی الحال تو کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔

میں نے اپنے احساس کمتری کو اپنی ذہانت کی وجہ سے کم کرنا چاہا۔ پہلے سے دگنی محنت شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ میری مخدوش صحت، یہ برا کھانے پینے سے ایک بار پھر میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ کیونکہ امی کے بتائے سارے بہلاوے نرے بہلاوے ہی ثابت ہوئے، لٹا

ایک دم سے معدے سے بوجھ بڑھنے سے میرا پیٹ خراب ہو گیا۔ امی نے گھبرا کے ساری قوت بخش معجون، حلوے اور مروٹے بند کر دیے۔

دن رات کی بڑھالی سے میں اور چھی سوکھ کے کاٹا ہو چکا تھا۔ لیکن مجھے اب اس کی پروا نہ تھی۔ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا یہی تو ایک راستہ تھا میرے پاس۔

ان ہی دنوں اسکول میں سالانہ تقسیم انعامات کی تقریب کا انعقاد ہوا۔ اس فنکشن میں تقریری مقابلے

چار سال تک کا بچہ لیتے ہیں۔ ”چار سال کی عمر میں تو جی میرا رضا میرا مطلب ہے۔ اب تو تب بست چھوٹا تھا۔“ ابو پہلے ہی اسکول کے ہاتھوں فرار سے انگلش بولتے پر نپل کو دیکھ کے رعب سے تھے۔ اس نے اعتراض نے ان کی رہی اسی خود اعتمادی بھی ختم کر دی۔

”آپ خود سوچیں کہ ایک بچہ چھ سال کی عمر میں پڑھائی شروع کرے گا، آٹھ سال کی عمر میں تعلیمی دور کا باقاعدہ آغاز کرے گا تو اسکول سے نکلتے نکلتے ہی اٹھارہ انیس سال کا ہو جائے گا۔ جبکہ تب تک عموماً“ بچے گریجویشن کر لیا کرتے ہیں۔ آپ کی سستی نے آپ کے بچے کو بہت پیچھے لا کھڑا کیا ہے۔“

”تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے میں تو بڑے شوق سے یہاں آیا تھا۔ آپ کا اسکول ہمارے نائے کاسب سے اچھا اسکول ہے۔“

”میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں حسین صاحب! لیکن سب بچے تین ساڑھے تین سال کے ہیں ایسے میں آپ کا بچہ کلاس میں سب سے الگ ہو گا۔ ویسے اگر آپ کو ہمارا اسکول اتنا پسند ہے تو میں آپ کے چھوٹے بیٹے کو داخلہ دینے پر تیار ہوں۔“

”چھوٹا بیٹا؟“

”اے لیس۔ یہی درست وقت ہے اسے داخلہ کرانے کا۔“ وہ میری طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے میں ان کی توجہ پر ذرا سا مسکرایا۔

”کیا عمر ہے اس کی؟“

”چھ سال۔“ ذرا توقف کے بعد ابو جواب دینے کے قابل ہوئے مگر اس جواب کے بعد پر نپل دیر تک اگلا سوال کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔

”میں اسی کا ایڈمیشن کرانے آیا تھا۔ یہی میرا اکلوتا بیٹا سا رضا ہے۔“

پر نپل کبھی مجھے، کبھی ابو کو دیکھ رہے تھے۔ ابو نے ان کی حیرت مکمل طور پر رفع کرنے کی کوشش کی۔

”یہ بچپن میں خاصا بیمار رہا ہے جناب اسی وجہ سے

پہلے ہی اسکول کے ہاتھوں فرار سے انگلش بولتے پر نپل کو دیکھ کے رعب سے تھے۔ اس نے اعتراض نے ان کی رہی اسی خود اعتمادی بھی ختم کر دی۔

”آپ خود سوچیں کہ ایک بچہ چھ سال کی عمر میں پڑھائی شروع کرے گا، آٹھ سال کی عمر میں تعلیمی دور کا باقاعدہ آغاز کرے گا تو اسکول سے نکلتے نکلتے ہی اٹھارہ انیس سال کا ہو جائے گا۔ جبکہ تب تک عموماً“ بچے گریجویشن کر لیا کرتے ہیں۔ آپ کی سستی نے آپ کے بچے کو بہت پیچھے لا کھڑا کیا ہے۔“

”تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے میں تو بڑے شوق سے یہاں آیا تھا۔ آپ کا اسکول ہمارے نائے کاسب سے اچھا اسکول ہے۔“

”میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں حسین صاحب! لیکن سب بچے تین ساڑھے تین سال کے ہیں ایسے میں آپ کا بچہ کلاس میں سب سے الگ ہو گا۔ ویسے اگر آپ کو ہمارا اسکول اتنا پسند ہے تو میں آپ کے چھوٹے بیٹے کو داخلہ دینے پر تیار ہوں۔“

”چھوٹا بیٹا؟“

”اے لیس۔ یہی درست وقت ہے اسے داخلہ کرانے کا۔“ وہ میری طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے میں ان کی توجہ پر ذرا سا مسکرایا۔

”کیا عمر ہے اس کی؟“

”چھ سال۔“ ذرا توقف کے بعد ابو جواب دینے کے قابل ہوئے مگر اس جواب کے بعد پر نپل دیر تک اگلا سوال کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔

”میں اسی کا ایڈمیشن کرانے آیا تھا۔ یہی میرا اکلوتا بیٹا سا رضا ہے۔“

پر نپل کبھی مجھے، کبھی ابو کو دیکھ رہے تھے۔ ابو نے ان کی حیرت مکمل طور پر رفع کرنے کی کوشش کی۔

”یہ بچپن میں خاصا بیمار رہا ہے جناب اسی وجہ سے

”میڈم نے کہا ہے میں نارمل نہیں ہوں۔ میں فزیکلی فٹ نہیں ہوں۔ میں ان بچوں جیسا نہیں ہوں۔“

میں بار بار یہی تکرار کر گیا۔ مس رخشندہ نے مجھے بہلانے کی خاصی کوشش کی لیکن بے کار۔ میری ڈائری میں لکھ کے انہوں نے ابو جی کو اسکول بلوایا اور ان سے نجانے کیا کچھ کہا کہ گھر واپسی پہ وہ بے حد سنجیدہ تھے۔

امی نے میرے لیے دسکی تھی میں گوندھ کے سوتی کے پیٹھے پرائیوٹ بنائے تھے۔ دو چار لقمے تو میں نے شوق سے کھائے مگر اب رسی تڑانے کی فکر میں تھا۔ امی مجھے گود میں تقریباً ”دلوچے ہوئے“ تھیں اور ایک کہانی میں الجھا کے میرا دھیان بٹا رہی تھیں جبکہ صالحہ باجی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پرائیوٹ کے چھوٹے چھوٹے لقمے توڑ کے میرے منہ میں ڈال رہی تھیں۔ ابو نماز پڑھ کے واپس آئے تو ایک لمحہ رک کے یہ منظر دیکھنے لگے۔ امی کی کہانی ایک دلچسپ موڑ پہ تھی، میرے انہماک کو موقع غنیمت جان کر باجی ایک اور لقمہ میرے منہ میں دے چکی تھیں اور میں بے دھیانی میں کھائے چلا جا رہا تھا۔

”رضاب گود میں بیٹھنے کی عمر سے نکل آیا ہے صالحہ کی ماں۔“ یکدم ابو کی ناگوار تاثر لیے آواز ابھری۔

”اسے خود سے کھانے کی عادت ڈالو صالحہ! کیا اب یہ ساری عمر تمہارے ہاتھ سے ہی نوالے کھاتا رہے گا۔“ اب انہوں نے باجی کو ڈنٹا۔

”کیا کروں، کچھ کھاتا پیتا ہی نہیں۔ سو سو جتن کر کے دو وقت کھلاتی ہوں نہ بھی چیز یا جتنا بڑھنے کی عمر میں ہے اور خوراک نہ ہونے کے برابر۔“ امی نے عذر پیش کیا۔

”بچے کو بھوک لگے گی تو کھالے گا اور بھوک لگتی ہے بھانگے دوڑنے کھیلنے کودنے سے۔ سارا دن تو تم اسے لڑکی کی طرح گھر میں بٹھائے رکھتی ہو۔ گود میں دیکے رہنے سے یہ خاک بڑھے گا۔“

محسوس کیا تھا لیکن پوری طرح سے اسے اجاگر کرنے میں دالہ پریل کامیاب رہی تھیں۔

میں کھٹے کھٹے قدموں سے وہاں سے نکل آیا تھا اور گراؤنڈ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے فزیکل انسٹرکٹر کو بچوں کو ٹریننگ دیتے اور ریکٹس کراتے دیکھنے لگا۔ لمبے تڑنگے صحت مند لڑکے باسکٹ بال کھیل رہے تھے۔ میں ان کی اچھاتی کودتی ٹانگیں دیکھنے لگا۔

”کیا سوچ رہے ہیں سهام رضا؟“ میرے شانے پہ کسی کے نرم ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ مس رخشندہ کی شیخ آواز یہ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ اپنے نرم خوشامد سے نقوش والے سانولے چہرے پہ ایک مہربان سی مسکراہٹ لیے مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس ذرا سی ہمدردی کو پا کر چھلک گئیں۔

”او کم آن سهام رضا! آپ ایک بہادر بچے ہیں۔ ذرا کی بات یہ ہمت تو نہیں ہارنی چاہیے۔“

”لیکن نیچر میں۔“ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ میں نے کہنا چاہا۔

”آئی نو، کیا ہوا جو اس مقابلے میں آپ حصہ نہیں لے رہے۔ آپ اتنے ٹیلنٹڈ ہیں اور کسی مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں۔“

”نو نیچر! میں باسکٹ بال نہیں کھیل سکتا۔ میں ریس میں بھاگ نہیں سکتا، بھاگ تو سکتا ہوں لیکن جیتوں گا تو نہیں میں تو شاید سب سے لاسٹ میں رہوں گا۔ میں مارچ پاسٹ میں بھی شامل نہیں ہوں۔ وہاں بھی سب لمبے لمبے اور Healthy لڑکے ہیں، میں تو Healthy نہیں ہوں۔“

”کیوں نہیں ہیں؟ اگر آپ صحت مند نہ ہوتے تو اتنا اچھا کیسے پڑھ پاتے پتا ہے جب تک کوئی فزیکل اسٹونگ نہ ہو وہ منٹلی بھی دیک ہی ہوتا ہے جبکہ آپ اپنی کلاس کے سب سے ذہین بچے ہیں۔ ہر بات سب سے پہلے یک کرتے ہیں۔“

میں یہ مناسب نہیں سمجھتا۔
میں انداز میں سر ہلایا۔
رکھنا درست نہیں ہو گیا۔
بہت اچھی طرح۔
دل نے بات نکال دی۔
ہے لیکن اور بہت کچھ۔
سے لا اور بچے بھی حصہ۔
میں اور اس بچے کو دیکھ۔
س بچے کو ڈانس۔ آتا اور۔
بیر مس اعتراض کریں۔
بچے شامل کیوں نہ۔
گے کہ سهام کلاس تھی۔
”میں۔“
”میڈم نے حسب۔“
ٹ ہو کے آیا ہوتا تو ہر۔
رتے کہ ہمارے پاس غیر۔
کہنا کہ یہ بچہ نارمل نہیں۔
لے ٹھیک نہیں۔“
ایک نارمل بچہ ہے۔“
میں زور دے کر کہا۔
”انہوں نے اس سے۔“
کے دی اور یہ فقرہ میرے۔
اور اب نارمل ہونا کے۔
اب تک واقف نہیں۔
ہو گیا کہ میں باقی بچوں۔
ہوں اور یہ الگ ہونا۔
پہ لکھا جاسکے، بلکہ میرا۔
سے اس شرمندگی اور۔
میں نے سنی بار۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ ان بچوں کو دیکھیں، اور میرے رضا کو دیکھیں۔ میرا نازک سا شہزادے جیسا بچہ اور وہ۔“

”چلو بیٹا، آپ باہر سائیکل چلاؤ۔“ ابو نے انہیں درمیان میں ٹوک کے مجھے کہا۔ میرے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ میں نے اپنی سائیکل اٹھائی اور گلی میں نکل گیا۔

”اتنی سخت دھوپ ہے۔ ابھی تو شام تک نہیں ہوئی اور آپ نے اسے باہر جانے دیا۔ لو لگ گئی تو؟“

”سب بچے باہر کھیل رہے ہیں یہ اکیلا اندر ماں کی گود میں بیٹھا بہن کے ہاتھ سے نوالے کھا رہا ہے۔“

”توبہ، آپ کو تو یہی بات چھ رہی ہے۔ اس وقت سے۔ کون سی ماں۔ بچے کو گود نہیں لیتی کون بہن دلار نہیں کرتی۔ کیسے باپ ہیں آپ اکلوتے بیٹے کو ملنے والی توجہ اور محبت بری لگ گئی، لے کے بے چارے کو باہر بھیج دیا اور میرے سامنے دوسرے بچوں کا ذکر تو نہ ہی کیا کریں۔ وہ عادی ہیں ان سب کے مگر رضا کا خون ہلکا ہے کچھ بھی ہو، سب سے پہلے اثر اسے ہی ہوتا ہے۔ سردی آتی نہیں کہ نزلہ زکام سب سے پہلے اسے پکڑتے ہیں اسی طرح گرمی بھی۔“

”یہ سب تمہاری حد سے بڑھی ہوئی احتیاط پسندی کا نتیجہ ہے۔ آج گیا تھا میں اس کے اسکول۔ اس کی استائی نے مجھے بتایا کہ کس طرح وہ اس سلوک اور غیر معمولی توجہ کی وجہ سے خود کو سب سے الگ سمجھنے لگا ہے۔“

”ہاں تو میرا بیٹا ہے ہی سب سے الگ، سب سے اچھا سب سے پیارا۔“ وہ ممتا سے چور لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”تم سمجھ نہیں رہیں۔ وہ خود کو باقی بچوں سے کم تر سمجھتا ہے۔ تم نے اسے یہ کہہ کہہ کے بزدل اور کم ہمت بنا دیا ہے کہ وہ باقی بچوں کی طرح صحت مند نہیں ہے، نہ ان کی طرح کھیل کود نہیں سکتا۔“

”تو اس میں غلط کیا ہے؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”رضانے پچھلے نو سال میں کون سی بیماری چھوڑی ہے۔ پیدا ہوا تو چڑیا کے بوٹ (بچہ) جتنا تھا ہاتھ میں لیتے ڈر لگتا تھا۔ تین ماہ کی عمر میں پہلی سردی آئی تو نمونے نے پکڑ لیا کتنے دن ہسپتال میں رہا۔ پھر سردی چلی گئی مگر نمونے کا اثر کتنے مہینے نہ گیا، کھانسی بگڑ گئی سینہ جلزا گیا۔ پچھلے ہی سال ایسا برا بیضہ ہوا کہ ہسپتال میں داخل کرانا پڑا، سارے جسم کا لانی ہو گیا تھا۔ چھ سال کی عمر میں اپینڈکس کا آپریشن بھی ہو گیا۔ ان کے علاوہ آئے دن موسمی اثرات کا شکار بھی سب سے پہلے یہ ہوتا ہے۔“

”مانتا ہوں، درست ہے یہ سب۔ لیکن اسے صحت مند رکھنے کے لیے ان سب ٹونکوں اور احتیاطوں کے بجائے وہ سب کرنا چاہیے جو اس کی استائی نے کیا ہے۔“

”کیوں اس نے کیا کرتا دیے؟“ امی کو اچھانہ لگا کہ انہیں میری حالت کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔

”انہوں نے کہا ہے کہ رضا کو ہر وقت یہ احساس دلانا چھوڑ دیا جائے کہ وہ باقی بچوں کی نسبت کمزور ہے۔ اس کے قد اور جسامت کے لحاظ سے اس کے ساتھ ننھے بچوں والا برتاؤ ترک کر دیا جائے۔ اسے ہر وہ کام کرنے کی کھلی اجازت دی جائے جو اس کی عمر کے بچے کرتے ہیں۔“

استائی صاحبہ نے بتایا ہے کہ ابھی بھی وقت ہے وہ بڑھنے کی عمر میں ہے اسے کسی قابل ڈاکٹر کو دکھایا جائے تو پتہ چلے گا کہ کس کمی کی وجہ سے اس کا قد بڑھنا رک گیا ہے اور غذا اس پر اثر کیوں نہیں کرتی۔ دواؤں اور کچھ ورزشوں کے ذریعے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“

ابو مجھے شہر کے ایک مانے ہوئے قاتل جائلز اسپیشلسٹ کے پاس لے گئے۔ جس نے میرے بغور معائنے اور کیس، سٹری جاننے کے بعد رائے دی۔

”آپ نے ابھی بھی بہت دیر کر دی ہے بچے کو لانے میں۔ ابتدائی علامات کے بعد ہی آپ کو اس کے علاج

اب زندگی میں پہلی بار اتنے رشتے داروں کو کھیرے دیکھ رہا تھا۔ یہ ہانچل نہ کھسا کھسی میرے لیے نئی چیز تھی۔ مگر کاش یہ میرے لیے خوشگوار بھی ثابت ہوئی۔

خاندان کے کئی بچے میرے ہم عمر تھے۔ وہ رشتے دار جنہوں نے مجھے عرصے بعد دیکھا تھا، وہ بڑھ چڑھ کے حیرانی کا اظہار کیا کرتے کہ میں اب تک ویسے کا ویسا کیوں ہوں جبکہ فلاں فلاں تو اس کی عمر کا ہونے کے باوجود۔۔۔ تب جواباً وہ عزیز جو ذرا قریبی تھے ان کی معلومات میں اضافہ کرتے کہ میرا یہ نقص پیدا نشی ہے اور ماں باپ کے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑنے کے باوجود مجھ میں بہتری کے کوئی امکان اب تک پیدا نہ ہوئے تھے۔

”ہائے ہائے۔۔۔ کیسے مانگ مانگ کے خدا سے بیٹا لیا تھا، بے چارے حسین نے اور قدرت کے رنگ دیکھو اللہ نے بیٹا دیا تو سہی مگر۔۔۔“

”سچ کہہ رہے ہو اللہ کسی کو اولاد کا دکھ نہ دے۔ کیا گزرتی ہوگی ماں بہنوں پہ کہ اکلوتا بھائی اور بیٹا۔۔۔ چہ چہ۔۔۔“

مختلف لوگوں سے آتے جاتے یہ باتیں سنتے ہوئے ایک بار پھر میرا اپنی ذات پہ سے اعتماد ڈانوا ڈول ہونے لگا۔ اسکول میں اپنی قابلیت اور ذہانت کے بدلے سمیٹی گئی واہ واہ اور تعریف و توصیف نہ رہے ڈھکوسلے لگنے لگے۔ کانوں میں بس ان لوگوں کے فقرے ہی گونجتے رہے۔

بے چارہ۔۔۔ بد نصیب اولاد کا دکھ، برہا پے کا سہارا وغیرہ۔۔۔

”نہیں بے کار ہے یہ ساری محنت بالکل اسی طرح جیسے یہ علاج بے کار ہے۔ میں جتنا مرضی پڑھ لکھ جاؤں، کتنا بھی بڑا آدمی کیوں نہ بن جاؤں، وہ کبھی مجھ پہ۔۔۔ اس بونے پہ۔۔۔ اس ٹھکنے بیٹے پہ فخر نہیں کر سکتے۔ میں اس دنیا میں اپنے ماں باپ کو صرف دکھ دینے کے لیے آیا ہوں۔“

پہلی بار میں نے یہ بات سوچی۔ اور ایسا سوچتے ہوئے میں اس چمک کو بالکل فراموش کر گیا، جو میری

کامیابی پہ ابو کے چہرے پہ نظر آتی تھی۔

ایسا سوچتے ہوئے مجھے وہ ٹھنڈک بھرا نور بھی یاد آتا تھا۔

ایسا سوچتے ہوئے میرے ذہن سے وہ ٹھنڈک نکل گئی جو میری بہنوں کے لبتے میں تب بچ اٹھتی تھی۔ جب وہ مجھے ”میرا راجہ بھیا“ کہہ کر دکھائی تھیں۔

مجھے کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ میں سب سے ہوں۔ ایک نامکمل عیب دار، جو دلے کر اس دنیا میں آیا ہوں۔



اور یہ میری عمر کا بیسواں سال ہے۔

ٹین اٹیج سے نکل کر پیچھو ر اٹیج کی جانب پہر

قدم۔

یہ الگ بات کہ میں شعور کی اس منزل پہ کئی ماہ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ شعور سے آگے تک کی نئی منزل میں نے وقت سے پہلے ہی طے کر لی تھیں۔

میری تمام تر ذہانت کے باوجود کبھی کبھار مزہ میرے قدم کی وجہ سے ملنے والی ناقدری اب بھی میز آنکھیں نم کر دیتی مگر اب میں آنسو پینا سیکھ گیا تو۔ ویسے بھی کالج کا ماحول، اسکول اور محلے کی نسبت، تکلیف دہ تھا۔ اکثر کلاس فیلوز مجھ سے لڑائی کرنے

سے کتراتے ضرور تھے مگر یہاں کوئی سرعام میرا مذاق

اڑانے والا نہ تھا۔ اس کالج میں کو ایجوکیشن تھی۔ ایک

سے ایک شوخ و چنچل لڑکی اور ایک سے بڑھ کے ایک

ذہین اور خوب لڑکا۔۔۔ مگر اچھے گھرانوں سے تعلق رکھنے

والے یہ تعلیم یافتہ سلجھے ہوئے نوجوان بھلے دل سے

مجھے اپنے جیسا تسلیم نہ کرتے ہوں، خود کو میری دوستی

کے لیے آمادہ نہ کر پاتے ہوں مگر اس کے باوجود وہ کھنکھ

کھلا میری تضحیک نہیں کرتے تھے۔ مجھ پہ ہتھیل

نہیں کتے تھے۔ میرے لیے کم از کم یہی امر باعث

اطمینان تھا اور یہ اطمینان مجھے یکسوئی سے عیبوں

جانب توجہ دینے میں خاصا معاون ثابت ہوا تھا۔

کے دوران ہی دونوں منوں کی شادی ہو گئی۔
 ”بار بار کومت سے آنا مشکل ہے۔ مثلاً
 اب اسکول جاتے ہیں پھر سعید کو بھی اکیلے رہنے سے
 مسئلہ ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات نکلنوں کا خرچہ
 کون سا کم ہے۔ میری تو پوری کوشش سے دونوں کی
 شادی میرے رہتے ہوئے ہو جائے یا کم از کم ایک کی
 شادی دوسری کی منتگنی ہی ہو جائے اس کے بعد انشاء
 اللہ پانچ سال بعد آؤں گی جب اپنے سوہنے بھیا کے سر
 پہ سہرا بندھے گا۔“

بیس سال کی عمر میں اپنی شادی کا تذکرہ سنتا ایسی
 انہونی بات نہیں تھی کہ میں اس بری طرح چونکتا۔
 میں بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا۔ یہ بات کسی اور نے
 کہی ہوتی تو میں سوچتا کہ میرا مذاق اڑایا گیا ہے مگر یہ
 بات کسی اور نے نہیں، میری پیاری باجی صالحہ نے کہی
 تھی۔

میں نے ان کا چہرہ کھوجنا چاہا۔ وہاں صرف ارمانوں
 کی الوہی چمک تھی اور وہی پیار وہی لاڈ جو بچپن سے
 مجھے ان سے ملتا رہا تھا۔

”پانچ سال بعد کیوں؟“ چار سالہ بنونے سوال کیا۔
 ”ماموں کی شادی بھی ابھی کرتے ہیں ماما۔“
 ”نہیں پاگل، ابھی ماموں چھوٹے ہیں، ابھی ان کی
 شادی کیسے ہو سکتی ہے۔“ چھ سالہ بنی نے اپنے تئیں
 بڑی سمجھداری سے بھائی کو سمجھانا چاہا۔ یقیناً اس کا
 مطلب وہ نہیں تھا جو مجھے لگا اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا

بھی تعلیم کے علاوہ میری اور کوئی دلچسپی یا سرگرمی تھی
 بھی نہیں کتابیں کتابیں اور صرف کتابیں۔ بچپن کے
 نکلوانے کے بعد میں نے غیر انصافی سرگرمیوں میں
 حصہ لینے کی دوبارہ پھر کبھی کوشش تک نہیں کی۔
 دوست بھی ایسے خاص نہ تھے، کالج میں بہت سے
 لڑکوں کی بہت سی لڑکیوں سے دوستی تھی۔ یونہی گپ
 شب کے دوران دوست مل کے کسی نہ کسی نام سے
 جب کسی کو چھیڑتے تو اس کے چہرے پہ جھینپا جھینپا سا
 ڈھکوارا اثر مجھے حیران کر جاتا۔ میں سوچتا کیا یہ جذبہ
 انہر کشش ہے؟ کسی لڑکے کو درخت کے سائے
 تلے بیچ پیٹھے سرگوشیوں میں گفتگو کرتے دیکھنا یا پھر
 کینٹین میں آنے سامنے بیٹھے بولتی آنکھوں سے
 ایک دوسرے کو تکتے دیکھنا مجھے اچھا لگتا تھا، پتہ نہیں
 کیوں؟

اپنی عمر کے حساب سے فطرت کے تقاضوں کے
 عین مطابق میں بھی صنف مخالف میں ایک کشش
 محسوس کرنے لگا تھا۔ خوب صورت، شوخ لڑکیوں کی
 ادائیں مجھے اپنی جانب کھینچتی تھیں مگر میں اپنی اوقات
 جانتا تھا۔ کبھی اتنی جسارت ہی نہیں کی جس کے نتیجے
 میں سرعام گلایاں پڑتیں۔ مجھے ڈر ہی نہیں پورا یقین
 تھا کہ اگر میں کسی عام سی صورت سے یا بالکل گئی گزری
 شکل والی لڑکی سے بھی اظہار محبت یا دوستی کی خواہش کا
 اظہار کر بیٹھا تو اس کا رد عمل کیا ہو گا۔ دل کی دل میں
 دبائے رکھنا وہ ہنر تھا، جس میں میں اب طاق ہو چکا
 تھا۔

صالحہ باجی سالوں بعد کومت سے آئی تھیں۔ خدیجہ
 باجی تو خیر یہیں لاہور میں ہوتی تھیں۔ فاطمہ اور موم
 بھی تعلیم مکمل کر چکی تھیں۔ فاطمہ تیس سال کی اور
 موم اکیس سال کی تھی۔ دونوں کے لیے رشتے تلاش
 کیے جارہے تھے۔ ورنہ ہمارے ہاں خاندان میں ہی
 رشتے تاتے طے کرنے کو اولیت دی جاتی تھی۔ صالحہ
 باجی کے آنے کے بعد یہ مہم زیادہ زور و شور پکڑ گئی۔ وہ
 ہاتھی تھیں کہ ان کے پاکستان میں اس چار ماہ کے قیام

بنتا ہوسا میکس بہن سے
 محض بنوں کے لیے جس سے
 میرا راجہ میرا کمر لڑکیوں کے
 دنوں رہا سوائے اس کے کہ
 ہاں محض عیب داروں کو دوسے
 * * *
 کبھی سوار سار سے
 کش کر بیچو راج کی
 میں شعور کیا اس منہ
 شعور سے آئی تک لگا
 کسی طے کرنا میرے
 نت کے بلو جو کبھی بور
 طے وان تا قدری اب
 راب میں آنسو پینا سیکو
 سکول اور محلے کی نسبت
 اس فیلوز مجھ سے
 مگر میں کوئی سرعام میر
 لاج میں کو ابجو کیشن
 کی اور ایک سے بڑھنے
 مجھے گھرانوں سے تعلق
 ہوئے نوجوان بھلے لگا
 تے ہوں خود کو میری
 س مگر اس کے باوجود
 رتے تھے مجھ پہ
 کم از کم ہی امیرا
 مجھے یکسوئی سے
 نون ثابت ہوا تھا

عمر نوان تجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

ایرپوسٹس

مہر و حصوں میں شائع ہو گئی ہے

مکتبہ عمران ڈیپارٹمنٹ ۳۲، دو بیلزار کراچی

تھا۔ مگر میں پتہ نہیں کیوں اس کے منہ سے یہ فقرہ سن کے بچل ہو گیا۔ چپکے سے کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے بنو کا سوال سنا۔ اب وہ پوچھ رہا تھا۔

”ماما! تو کیا پانچ سال بعد ماموں بڑے ہو جائیں گے۔
شان کے ماموں جتنے؟“

پتا نہیں باجی نے کیا جواب دیا ہو گا۔ نہ میں نے سنا نہ ہی میں سنا چاہتا تھا۔



اس دن میں کالج سے واپس آیا تو صالحہ باجی نے مجھے ایک لمبی سی لسٹ پکڑا دی۔

”جاؤ بیکری سے یہ سب چیزیں لے کر آؤ۔ کباب، چاٹ اور حلوہ میں نے گھر پہ ہی تیار کر لیا ہے۔ خدیجہ بھی صبح سے آئی ہوئی ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ مریم یا فاطمہ کے رشتے کے لیے پھر سے کوئی آرہا ہے مگر غیر معمولی اہتمام نے مجھے چونکا دیا۔

”کیا کوئی خاص مہمان ہے؟“

”ہاں پچھلی اتوار کو تم گھر پر نہیں تھے تب جو لوگ فاطمہ کو پسند کر گئے تھے وہی دوبارہ آ رہے ہیں۔ پرسوں میں بھی امی اور ابو کے ساتھ لڑکا دیکھ آئی تھی۔ اچھا خاصا ہے دیکھنے میں بھی اور کماتا بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ لوگ بھی شریف اور خاندانی ہیں کل ہم نے بھی فون کر کے پسندیدگی ظاہر کر دی۔ آج باضابطہ ہاں ہو گی۔ تم سامان لا کر پھر سے کھسک نہ جانا۔ بچے نہیں رہے اب اکلوتے بھائی ہو اس موقع پہ تمہارا ہونا ضروری ہے۔“

میں بیکری سے ناشتے کا سامان لا کر دینے کے بعد نہانے چلا گیا۔ باجی نے سختی سے تاکید نہ کی ہوتی تو میرا کوئی ارادہ نہ تھا انجانے مہمانوں کے سامنے جانے کا۔ میں تو رشتے داروں تک سے ملنے سے احتراز ہی کیا کرتا۔ اچھی لوگوں کے سامنے تو ویسے بھی جلد گھبرا جاتا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر نہانے اور تیار ہونے میں خاصی دیر لگائی۔ میں شیو کر رہا تھا کہ مہمان آگئے پھر بھی میں اطمینان سے شیو کرتا رہا۔ یہ واحد عمل تھا جسے میں

پوری دلچسپی کے ساتھ کیا کرتا۔ شاید اس سے میری نفسیاتی تسکین ہوتی ہو۔

آفٹر شیو لگانے کے بعد میں نے بالوں میں ہینڈل پھیرتے ہوئے اپنا جائزہ لیا نہ مانے دھوئے اور راز لگ رہی تھی۔ پورے چہرے پہ پھیلی آنکھیں پیرا طرح مجھے سخت بری لگیں۔ شاید آنکھیں اتنا نہیں نہیں تھیں جتنا چہرہ ضرورت سے زیادہ چھو ہوا ہوتے۔ وجہ سے بڑی لگتی۔ پچکے ہوئے ہیل نوکدار تھوڑے رخساروں کی نمایاں ہوتی ہڈی ابھری ہوئی بالزون اور چارٹ ڈیڑھ انچ قد کے ساتھ میں ہرگز اتنا با اعتماد تو کہ مہمانوں کے سامنے جاسکتا مگر مجھے جانا پڑا۔ کلف لگا کر کڑا تا سفید شلوار قمیص پہن کے سیٹے سے بل جمائے میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور مہمانوں کو مؤدبانہ سلام کیا۔ وہ چند عورتیں اور چند مرد تھے۔ میری آنکھیں ایک بار سرسری ساٹھنے کے بعد جھک گئی تھیں۔ میں سامنے والوں کی نگاہوں میں نیچے تاثرات سے انجان رہنا چاہتا تھا ان نگاہوں میں کیا تھا۔

حیرت، استعجاب۔

ترحم، ہمدردی۔

”یہ میرا بیٹا ہے، سهام رضا سب سے چھوٹا اور اکلوتا۔“ ابو جی نے تعارف کرایا۔

”ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔“

نجانے کیوں آج مجھے ابو جی کے لہجے کا فخر اور دل بھی کھوکھلا محسوس ہو رہا تھا۔

”کون سی کلاس میں پڑھتے ہو بیٹا؟“

پتہ نہیں یہ سوال کس نے کیا تھا مگر جس نے بھی کیا تھا اپنی الجھن دور کرنے کے لیے کیا ہو گا۔ میرے بابا تیرہ سالہ بچے کے برابر قد، نحیف و نزار و جو وہ اسے کچھ اور گمان گزرا ہو گا مگر میرے چہرے نے اسے کسی لڑکے میں جتلا کیا ہو گا۔

”جی، بی کام کر رہا ہوں۔“

میرے جواب سے یقیناً اس کا شک یقین میں بدل گیا۔

”یہ پند لوں کے لیے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔“
 ”آپ سے سوئے لیجئے تا لحد سے ہو رہے ہیں۔“
 ”یہ حلوہ فاطمہ نے خود بتایا ہے۔ بڑا ذائقہ ہے اس کے ہاتھ میں۔“

”آپ کے لیے چائے اور زکالوں؟“
 ان کی معنی خیز خاموشی کا تاثر زائل کرنے کے لیے دونوں باجیاں مسلمان نوازی میں جُت گئیں۔
 ”آپ کے خاندان میں ایسے اور بھی کیس ہیں؟“
 کافی دیر بعد وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

”جی، کیا مطلب؟“ حالانکہ ابوجی مطلب تو سمجھ گئے تھے۔

”میرا مطلب ہے، یہ آپ کا خاندانی مرض ہے؟ کیونکہ آپ کا کہنا ہے کہ آپ کے ہاں زیادہ تر شادیاں خاندان میں ہی ہوتی ہیں۔“
 ”جی۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں یہ مرض میرا مطلب۔“

میں خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ جانتا تھا میرے سامنے ابوجی اس مرض کو مرض کہنے میں وقت محسوس کر رہے تھے۔ میرے وہاں سے جانے کے بعد کیا ہوا یہ تو نہیں پتہ۔ مگر یہ رشتہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ باجی نے وجہ یہ بتائی۔

”بڑے لالچی لوگ تھے، لڑکا بھی معمولی سا تعلیم یافتہ تھا۔ خالی پیسے کو کیا کرنا ہے۔ چار لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کے قابل تو ہو بندہ۔ ہونہہ پنڈو جاہل لوگ۔“

میں کہہ نہ سکا کہ کل تک جو لوگ خاندانی شریف اور سلجھے ہوئے تھے، یکایک جاہل پنڈو اور لالچی کیسے ہو گئے۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ ایسے گھر کی لڑکی کو بہو بنا کر اپنی نسل خراب نہیں کرنا چاہتے، جس کا سگا بھائی ٹھکنے پن کی بیماری میں مبتلا ہے۔

مجھے اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا۔ کئی روز تک میں فاطمہ کے سامنے جانے کی ہمت نہ کر سکا، حالانکہ اس نے اور باقی سب ہی نے مجھے کسی طور یہ احساس دلانے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش نہیں کی کہ ان حالات کا زمہ دار میں ہوں مگر میں اتنا بے حس نہ تھا۔

شاید میرا یہ احساس جرم کچھ دن اور رہتا کہ صالحہ باجی کی بھاگ دوڑ رنگ لائی۔ فاطمہ کا رشتہ بہت اچھا جگہ ملے ہو گیا۔ اس بار براہ راست شادی ہی مقرر ہوئی۔ حیرت کا مقام یہ تھا کہ پہلے جس رشتے میں باقی نے پنڈو ہونے کا عیب بتایا تھا، اب اس نئے رشتے میں بھی وہی خوبی پائی جاتی تھی لیکن اب دسمالی پس منظر رکھنے والے اس گھرانے کے پنڈو پن کو سادگی سے تعبیر کر کے گن گائے جا رہے تھے۔ لوید بھائی کے والدین اگرچہ زمیندار تھے اور سیدھے سادے دسمالی لوگ تھے لیکن وہ خود مناسب حد تک تعلیم یافتہ تھے، خاصے سلجھے ہوئے اور چلتے ہوئے کاروبار کے مالک تھے۔ حیرت انگیز طور پر ان لوگوں کے لیے میرا قد بھی کوئی مسئلہ نہ بنا بلکہ انہوں نے میری گریجویٹ سلیقہ مند سکھڑ اور خوب صورت بہن فاطمہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اس کا گھرا چھی طرح بس جانے کی طمانیت نے مجھے اس سے نظریں ملانے کے قابل ضرور کر دیا، لیکن میں اپنے دل سے ذلت کا وہ احساس نہ نکال پایا جو اس ایک لمحے میں مجھے اپنے ہی گھر والوں کے سامنے کم مایہ کر گیا تھا۔



اور یہ میری عمر کا پچیسواں سال ہے۔ ایم بی اے کرنے کے بعد پچھلے ایک سال سے میں اچھی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہوں مگر اچھی تو کیا گزارے لائق جا ب بھی نہیں ملی۔ میں جانتا تھا یہ ایک سال تو کچھ بھی نہیں، لوگ ملازمت تلاش کرنے میں جو تیاں چٹھایا ہی کرتے ہیں، کئی کئی سال ہاتھ پیر مارتے ہیں لیکن میں ایک سال سے بھی کم عرصے میں ہمت ہار بیٹھا۔ ہمت بندھائے رکھنے کے لیے میرے پاس کوئی وجہ بھی تو نہیں تھی۔ میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ میرا چار فٹ ڈیڑھ انچ قد تھا جس کے بڑھنے کا اب نہ کوئی امکان تھا نہ امید۔ میں جہاں بھی انٹرویو کے لیے گیا، کہیں مناسب الفاظ میں معقول جواز بتا کے اور کہیں صاف گوئی کی انتہا کرتے ہوئے واضح

انداز میں میری کوتاہ قاستی کی وجہ سے مجھے ملازمت کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا۔

میں جب بھی کہیں انٹرویو دے کے واپس آتا، ابو جی کے چہرے پہ لاکھوں سوال، ہزاروں امیدیں ہوتیں، میں ان امیدوں، ان سوالوں کو دیکھ کے سر جھکا لیتا اور وہ میرے جھکے ہوئے سر اور جھبے ہوئے چہرے پہ لکھے ہزاروں جوابوں اور لاتعداد ناامیدیوں کو دیکھ کے نظریں جھکا لیتے۔ ویسے بھی اب وہ بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی سانس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اب تو انہوں نے مجھ سے اپنے ان خوابوں کا تذکرہ کرنا بھی رفتہ رفتہ کم کر دیا تھا جو بچپن سے وہ ایک تو اتر کے ساتھ کرتے آ رہے تھے مجھے زندگی میں کسی اہم اور اونچے مقام پہ فائز دیکھنے کا خواب۔ مجھے ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھ سے اپنے خواب چھپاتے چھپاتے وہ خود بھی کہیں چھپ گئے، اپنے خوابوں کے ساتھ ہی یہ دنیا بھی چھوڑ گئے۔ باپ کے سائے سے محرومی۔ اور وہ بھی ایسے شفیق باپ کا سا، جو بچپن میں انگلی پکڑ کے چلنا سکھانے کے بعد بھی پچیس سال تک ہر قدم پہ مجھے حوصلہ دیتا رہا، میرے اندر مرتی ہوئی ہمت اور امید کو نت نئے حربوں سے زندہ کرنے کی اپنی سی کوششیں کرتا رہا، ایسے باپ کے سائے سے محروم ہونا ایک لخت ٹھنڈے بادلوں کی چھاؤں سے تپتے سورج کے نیچے آنے کے مترادف تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں بھرے میلے میں تنہا ہو گیا ہوں، کسی چھوٹے سے بچے کی طرح ہراساں و وحشت زدہ۔

لیکن بعد میں گزرتے دنوں نے مجھے احساس دلایا کہ واقعی اللہ کا کوئی کام مصلحت سے عاری نہیں ہوتا۔ شاید ان کے جانے میں ہی بہتری تھی۔ وہ جب تک زندہ رہے، بھلے میں ان کے خواب پورے نہ کر سکا مگر ان خوابوں کو توڑ بھی تو نہ پایا لیکن اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو انہی خوابوں کی ٹولی کہ جیاں انہیں لہولہاں کر دیتیں۔ ساری عمر دل میں اپنے اکلوتے بیٹے کے حوالے سے اتنے بلند اور اونچے خواب دیکھنے والے

میرے ابو جی کیسے برداشت کر پاتے کہ ان کی ذہن و فطین، لائق فائق، اسکول سے لے کر مان اور یونیورسٹی تک میں پوزیشنز لینے والا اور ایم پی اے کی ڈگری رکھنے والا بیٹا ان کے اسٹور پہ ان کی جگہ بیٹھ کر سودا تو لے کر بیٹھتا تھا۔

ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ ابو کی زندگی میں ہی ان کی بیماری کی وجہ سے گھر کے حالات پر اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا کیونکہ ہفتے کے تین سے چار دن تو اسٹور بند ہی رہا کرتا، جو دو تین کھلتا بھی تو اب ابو جی باقاعدگی سے سامان لا کر ڈالنے کے قابل نہ رہے تھے۔

ابو جی نے دیانت داری کو ہمیشہ اولیت دی، معیار کا عمدہ ہونا اور قیمتیں مناسب ہونا بھی اس کے جاننے کی اہم وجہ تھی۔ اسی معمولی سے پان سکرٹ کے کھوکھے نے ترقی کرتے کرتے اچھے خاصی معیاری جنرل اسٹور کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کی آمدنی سے ابو جی نے یہ ذاتی کشادہ مکان تعمیر کیا۔ میری تعلیم مکمل کرائی، میری تین بہنیں باعزت طریقے سے بیاہیں۔ لیکن اب ان کی بیماری کی وجہ سے اسی رزق کی برکت میں کمی ہونے لگی۔ آخری دنوں میں ان کے علاج پہ باقی جمع شدہ رقم بھی لگ گئی۔ چند دن سوگ میں ہی دکان بند رہی اور جب امی نے مجھ سے کہا۔

”گھر کا راشن ختم ہو گیا ہے۔ آنا جانا بھی لگا رہتا ہے۔ جب تک چالیسواں نہیں ہوتا، افسوس اور تعزیت کے لیے لوگ آتے ہی رہیں گے۔ ایسا کرو، دکان کی چابیاں لو، ایک گھی کا ڈبہ، آٹے کا تھیلا، ساری دالوں کا ایک ایک کلو کا پیکٹ اور کچھ صابن، سرف وغیرہ لے آؤ۔ گھر میں ضرورت ہے۔“

میں نے چابیاں ان کے ہاتھ سے لے لیں اور غائب دماغی سے ان کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے اسٹور کے تالے کھولنے لگا۔ شراٹھا کے اندر داخل ہونے کے بعد جب میں نے ان کا مطلوبہ سامان اکٹھا کرنا چاہا تو میری ساری غائب دماغی بھک سے اڑ گئی۔ اسٹور میں فقط اتنا سامان بچا تھا کہ صرف ہمارے گھر کے راشن کے لیے ہی تین چار یا زیادہ سے زیادہ چھ ماہ

تک چل سنا سنا بیٹھنے کی اہمیت تو بہت دور کی بات تھی جبکہ ای کا ارادہ تھا کہ میں ادھر ادھر سے دیکھ بھال کے کوئی قابل بھروسہ آدمی رکھ لوں اسٹور چلانے کے لیے تاکہ وہ ایک گھنٹی بندھی تنخواہ کے بدلے اس کاروبار کو جاری رکھ سکے۔

میں نے کھلے میں سب ہی والوں، نمک مرچ اور چاول وغیرہ کے پکٹ ڈالے۔ گھی کا ڈبہ آٹے کا ٹھیا، موٹر سائیکل کے پیچھے باندھا۔

”اس مہینے تک گا گزارا تو ہو جائے گا اور اس سے اگلے مہینے کا بھی۔ شاید اس سے اگلے مہینے کا بھی آسانی سے۔ مگر کیا گھر کا خرچہ صرف آٹے، گھی اور والوں تک محدود ہے؟۔ بجلی، پانی اور گیس کے بل، امی کی دوائیں اور سب سے بڑھ کے مریم، جس کی منگنی ڈیڑھ سال پہلے صالحہ باجی کے سیرال میں ہو چکی تھی اور اگلے مہینے اس کی شادی طے تھی۔ اگرچہ ابو جی کی وفات کی وجہ سے خود بخود یہ شادی کچھ عرصے کے لیے ملتوی ہو گئی تھی مگر کب تک؟ کچھ ماہ بعد وہ لوگ دوبارہ تاریخ مانگنے آئیں گے بے شک امی نے اس کے لیے زیور، کراکری اور ضروری الیکٹریک کا سامان جوڑ رکھا تھا، ابو جی نے ایڈوائس دے کر فرنیچر بھی آرڈر کر رکھا تھا لیکن شادی کی تقریب کے اور بھی خرچے ہوتے ہیں۔ ان چیدہ چیدہ انتظامات کے بعد بھی مجھے کم از کم ایک لاکھ تو چاہیے تھا اس کو رخصت کرنے کے لیے۔ گھر بیٹھتے ہی میں نے سودا امی کے حوالے کرتے ہوئے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا، جو جلدی میں تو کیا گیا تھا مگر بروقت بھی تھا۔

”ابو جی کے اکاؤنٹ میں اندازاً ”کتنی رقم ہوگی؟“

”تمہیں بہتر پتا ہو گا بیٹا! میں بھلا یہ سب کیا جانوں۔“ میں ان کی الماری سے چند کاغذات نکال لایا۔

”ایک لاکھ پچیس ہزار۔“ میں نے انہیں بتایا ”مریم کی شادی کرنے کے بعد ان میں سے شاید بیس یا تیس ہزار بچ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی شادی ہونے تک ہم گھر بیٹھے ان پیسوں میں سے

آدمی سے زیادہ خستہ کرنا انہیں۔“
”لیکن ہم کیوں خستہ کریں گے جہاں یہ ہمیں رکھ گیا ہے۔ اللہ بخشے جاتے جاتے اپنی اس آخری ذمہ داری سے بھی منہ نہیں موڑا یہ سوال لاکھ روپیہ بھی نہیں کس مشکل سے بچایا ہو گا اور نہ پچھلے دو سالوں سے سارا جمع جتنا تو اس دکان کو خریدنے لگا دیا۔“

”یہ بھی ابو جی کی دور اندیشی تھی امی! گھر بیٹھے تو خزانے ختم ہو جایا کرتے ہیں۔ اچھا کیا جو انہوں نے اپنی جمع شدہ رقم کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا۔ آج مکان کے ساتھ ساتھ وہ دکان بھی ہماری ذاتی ہے ورنہ میں تو نا تجربہ کار ہوں، نجانے اسٹور اچھی طرح چلا پاؤں یا نہیں؟ شروع شروع میں شاید اتنی آسانی نہ ہو، ایسے میں اگر اسٹور کا ماہانہ کرایہ بھی بھرنا پڑتا تو اتنی مشکل ہوتی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ انہوں نے سر ہلا کے تائید کی پھر جیسے بری طرح چونکیں۔

”تو اسٹور چلائے گا؟ وہاں بیٹھے گا؟۔ مگر کس لیے؟ ہمیں نے کہا تو ہے کسی بندے کا انتظام۔“

”قابل بھروسہ آدمی کہاں سے ڈھونڈوں۔“ میں نے ان کی بات کالی اور پھر وہ آدمی قابل بھروسہ ہو یا بے اعتبار، تنخواہ تو مانگے گا۔ مکمل طور پر کاروبار کسی انجان شخص کے سپرد کر دینا اور بات ہے۔ میں کوئی لڑکا رکھ لوں گا اسی محلے کا اور پھر امی میں فارغ بھی تو ہوتا ہوں۔“ آخری فقرہ کہتے کہتے میرا لہجہ پست ہو گیا۔ وہ کتنی دیر چپ رہیں۔ میں نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔ چادر کے پلو سے اپنی نم آنکھیں رگڑ رہی تھیں۔

”یہ بہت ضروری ہے امی! فی الحال ہمارے پاس آمدنی کا یہ واحد ذریعہ ہے اپنے ہاتھوں سے کیسے برابرا ہونے دوں۔ اسی اسٹور کی کمائی سے یہ گھر بتا، آپ کی اولاد پل بڑھی، کیا برائی ہے یہاں بیٹھنے میں؟ آپ فکر نہ کریں، میں ساتھ ساتھ ملازمت کی تلاش جاری رکھوں گا۔“ میں نے محض ان کو دلاسا دینے کی غرض سے کہا۔

”بس آپ اتنی اجازت دیں کہ ان روپوں میں سے میں پچاس ہزار نکال لوں اسٹور تقریباً خالی بڑا ہے مجھے سلمان ڈالنا ہے۔ ابھی کم از کم چھ سات مہینے تک تو مریم کے سرال والے تاریخ نہیں مانگیں گے۔ تب تک میں انشاء اللہ پچاس کے بجائے ستراسی ہزار واپس بینک میں رکھوا دوں گا۔“

میں واقعی نا تجربہ کار تھا۔ ابو جی کے قریبی دوست انکل غفار جو اس پیشے سے وابستہ تھے ان کے ساتھ میں ہول سیل مارکیٹ خریداری کے لیے گیا تو سامان بے شک پورا ہو گیا لیکن پچاس ہزار چند ہی دن میں ہاتھ سے نکل گئے۔ جبکہ میں نے اسٹور کے لیے اور بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ امی سے تذکرہ کیا تو انہوں نے اپنا بالی ماندہ زیور مجھے تھما دیا۔



اس دن مریم کو رخصت ہوئے صرف تین دن گزرے تھے۔ خدیجہ باجی اور فاطمہ ابھی یہیں تھیں۔ صالحہ باجی چونکہ چھ ماہ پہلے ہی ابو جی کی وفات سے آئی تھیں اس لیے مریم کی شادی میں شرکت نہ کر سکیں۔

وہ بھی مریم کچھ ہفتے بعد شوہر کے ساتھ کویت ہی جانے والی تھی۔ خدیجہ باجی اور فاطمہ بھی جانے کی تیاری میں تھیں تب امی نے ایک عجیب سی بات کی جو شاید اتنی عجیب ہرگز نہ تھی جتنی کہ مجھے لگی۔

”اتنے آرام سے نہ بیٹھو ساری کی ساری۔“ انہوں نے بیٹیوں کو ڈیٹے ہوئے کہا جس میں پیار کے ساتھ ساتھ ایک فرمائش کی تمہید بھی تھی۔

”جانتا بھی ہے کہ اب میں تکتی اکیلی رہ گئی ہوں۔ ساری کی ساری چڑیاں اڑ گئیں اس آنگن سے۔ ایک تو پہلے ہی پردیسن تھی اب دوسری کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ کچھ میرے بارے میں بھی سوچا۔“

”تو امی! ہم دونوں تو ہیں نا۔ آتی جاتی رہتی ہیں آپ کے پاس بلکہ مریم کے جانے کے بعد اب خیال رکھوں گی کہ ہر ہفتے کم از کم ایک رات ضرور رہنے کے لیے آؤں۔“ فاطمہ نے ان کے ہاتھ تھام کے وعدہ کیا۔

”اللہ تم دونوں کو اپنے اپنے گھر اور بل بھرتے ساتھ ہنسنا بستا آباد رکھے۔ کب تک اپنے گھر کے دھندے چھوڑ کے بچھے دیکھنے آتی رہو گی۔“

”ہاں فاطمہ کو مسئلہ ہو سکتا ہے مگر مجھے تو نہیں۔“ صالحہ باجی نے کھوکھلی سی ہنسی ہنس کے کہا۔ شادی کے اتنے سال بعد بھی وہ نوز اولاد کی نعمت سے محروم تھیں۔ پھر اپنی اداس آنکھوں کے غم گوشے بے دردی سے رگڑتے ہوئے انہوں نے ایک نیا ہی مشورہ دیا۔

”یا پھر مستقل بندوبست تو آپ کی تنہائی کا یہی ہو سکتا ہے کہ آپ اب بھولے ہی آئیں۔ یہ والی بیٹی مستقل بنیادوں پر آئے گی یعنی اس کے اڑ کے جانے کا بھی کوئی خطرہ یا امکان نہیں رہے گا۔ کیوں سام! تمہارا کیا خیال ہے؟“

ان کے براہ راست مجھ سے پوچھنے پہ میں بڑبڑا گیا۔ امی البتہ نہال ہو گئیں۔

”یہ کی تا میرے دل کی بات۔ یہی تو میں چاہتی ہوں۔ بجائے میرے گھر کے چکر لگانے کے، میرا خیال رکھنے والی اور اس سونے گھر کو آباد کرنے والی کی تلاش کرو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی۔“

دنیا بھر کے منتخب دلچسپ کہانیاں

پہلا کتابچہ

دیکھ کر تحریریں کا مجموعہ
تکھے ذہنوں کا سامن

مرمات کے

۲۵ روپے

حضرت مولانا

عمران ڈائجسٹ

انتد سارہ طبع



ملحاضہ

کراچی

میرے کہیں ای۔ ابھی سام کی مہربانی کیا ہے۔ اب
باز کے تیس تیس سال کی عمر تک شادی کا سوچتے تک
نہیں۔ وہ ابھی کچھ ماہ پہلے تو پچیس کا ہوا ہے۔ آپ فکر
نہ کریں ہم ابھی سے تلاش شروع کر دیتے ہیں۔
”کہہ نہیں نہ کہیں سے کوئی عقل کی اندھی مل
جائے۔“ میں نے جل کے ان کی بات مکمل کی۔
”یا پھر کوئی ایسے لاچار قسم کے ماں باپ جن کے سر
پہ ان کی بیٹی اتنی بھاری ہو کہ وہ اسے اتار کے کہیں بھی
پھینک سکتے ہوں۔“

”کیوں کرتے ہو ایسی باتیں؟“ باجی بگڑ گئیں۔

”اچھا چھوڑیں باجی!“ فاطمہ نے موضوع کو ہلکا
پھلکا کرنے کی کوشش کی۔

”لگتا ہے سام کو پسند نہیں کہ ہم اس کے لیے لڑکی
تلاش کریں ہو سکتا ہے وہ یہ کام خود انجام دینا چاہتا ہو یا
پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا وہ کر چکا ہو، کیوں؟“ اس
نے شرارت سے مجھے دیکھا۔ میں اور بھی گڑبڑا سا گیا۔
ای نے لاڈ سے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

”چل ہٹ شرر مذاق نہ کر۔ میرا بیٹا ایسا نہیں اتنا
شریف بخیر ہے میرا۔ مجال ہے جو کبھی آنکھ اٹھا کے
کسی لڑکی کی جانب دیکھا ہو۔“

”اوہو،“ کسی کو پسند کرنے سے شرافت پہ بھلا کون سا
حرف آجاتا ہے۔ اگر اس کی کوئی پسند ہے تو اس میں
حرج کیا ہے اسی۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جیسے میرا بیٹا راضی،
میں اسی پہ خوش۔“ ای نے مجھے گریدا۔ ”بول رضا پتر!
تیری نظر میں ہے کوئی؟“

”نظر میں؟“ اچانک بلا ارادہ بن بلائے ہی ایک چہرہ
نظر میں آ گیا۔ میں نے گھبرا کے سر جھٹکا اور اٹھ کھڑا
ہوا۔

”نہیں۔“ میں سختی سے کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا
مگر نہیں، نہیں کی تکرار بھی نظروں سے اس چہرے کو
ہٹانہ سکی۔ تنگ آ کے میں نے آنکھیں موند لیں مگر
ابہ چہرہ پوری طرح مجھ پہ حاوی ہو گیا۔

یہ چہرہ ندا کا تھا۔

ندا ہمارے گھر سے صرف چار گھر چھوڑ کے اوپر
والے پورشن میں آئے نئے کرائے دار ملک صاحب
کے سات بچوں میں سے ایک تھی، یہ علاقہ متوسط طبقے
کے رہائشی لوگوں پہ مشتمل تھا۔ جن میں چند خوشحال
کھاتے پیتے گھرانے بھی تھے اور چند سفید پوش بھی۔
لیکن ایک بات جو سبھی گھرانوں کے رہن سہن میں
مشترک تھی وہ سادگی اور روایتی طرز زندگی تھا۔ ملک
صاحب کو اس محلے میں آئے سال سے اوپر نہ ہوا تھا۔

وہ کسی نیم سرکاری ادارے میں ملازم تھے، ایک پرانی
سی اسکول پر آتے جاتے تھے۔ سات بچوں کے ساتھ
اس مزدگانی کے دور میں کرائے کے مکان میں کسے
گزارا کرتے تھے اس کا اندازہ ان کو اور ان کے بچوں کو
دیکھ کے بخوبی ہو جاتا تھا۔ ندا سب سے بڑی تھی، عمر
یہی کوئی اٹھارہ انیس برس رہی ہوگی، اس کے بعد اوپر
تیلے کے چار لڑکے تھے جن میں سب سے بڑا پندرہ
سالہ لڑکا تو کسی فریج اور اے سی کی سروس کرنے
والے ورکشاپ میں کام کرتا تھا جبکہ چھوٹے تینوں
اسکول جاتے تھے۔ ان سے چھوٹی دو بچیاں، جن میں
سے ایک کی انگلی تھامے اور دوسری کو گود میں اٹھائے
ندا میرے اسٹور پہ سودا سلف لینے آیا کرتی۔

وہ واحد لڑکی نہ تھی جو اسٹور پہ خریداری کرنے آتی
تھی۔ میری محلے دار خواتین میں سے زیادہ تر شادی
شدہ گھریلو یا پھر بڑی عمر کی عورتیں ہوتیں۔ ایسے میں
ندا جیسی نو عمر شوخ، بے تکلف اور حسین لڑکی کا بلا
نانہ اور تواتر کے ساتھ یہاں آنا خود بخود مجھے اس کی
جانب متوجہ کر گیا۔

وہ بہت عام سی چیزیں لینے آتی اور نہایت کم مقدار
میں کبھی ایک کلو آٹا، کبھی آدھ پاؤ مسور کی وال، کبھی پاؤ
بھر گھی۔ میں نے اس سے معذرت کی۔

”لی لی! آٹے کا سب سے چھوٹا ٹھیلا پانچ کلو کا ہے
اور وال کے پیکٹ بنا کے رکھے ہیں، سب سے کم وزن
کا ایک پاؤ کا ہے ہاں گھی کا یہ پاؤ والا پیکٹ ہے۔“ میں
نے اس کے آگے پیکٹ رکھا۔

”مگر میں تو حساب سے پیسے گن کے لائی ہوں۔“

اس نے بے چارگی سے کہا۔ میں نے ایک نظر اس کے پریشان چہرے کو دیکھا اور دوسری نظر اس کا پلو کھینچے ہوئے نالیوں والے جار کی جانب اسے متوجہ کرتی تین سالہ بچی کو دیکھا۔

”کوئی بات نہیں۔ میں لکھ کے رکھ لیتا ہوں“ آپ سامن لے جائیں، باقی پیسے کل پرسوں آجائیں گے۔ آپ نوید صاحب کے نئے کرائے دار ملک صاحب کے ہاں سے آئی ہیں نا؟“

یہ اس سے گفتگو کا میرا پہلا موقع تھا۔

”ہاں جی، میں ان کی بڑی بیٹی ندا ہوں۔“ اس نے خود ہی تعارف کرایا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“

”جی؟“ میں اس سوال پہ حیران ہوا۔ میرے لیے اس کی بے تکلفی غیر متوقع تھی۔

”ابو نے پوچھا تو انہیں کیا بتاؤں گی کہ کن صاحب سے ادھار لے کر آئی ہوں۔“

”میرا نام سام رضا ہے۔ آپ کہہ دیجئے گا کہ رضا سراسر سے کھاتے میں سامن لیا ہے۔ میری آپ کے والد سے اچھی علیک سلیک ہے۔“

”چلیں پھر تو مسئلہ نہیں۔“ اس نے بے فکری سے سیکس شاپر میں ڈالنا شروع کیے۔ میں نے جار میں ہاتھ ڈال کے دو تافیاں نکالیں اور دونوں بچیوں کو تھامیں۔

”نہیں یہ رہنے دیں۔“ اس کے منع کرنے پہ میں نے زبردستی بچوں کے ہاتھ میں تھام دیں۔

”میں اسٹور پہ آنے والے بچوں کو سویش دیتا ہی رہتا ہوں۔ یوں سمجھیں یہ میری اسپیشل کسٹمر ڈویلنگ ہے۔“

”اساتے تو حساب میں نہیں لکھیں گے؟“

میں نے مسکراہٹ بابتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر مجھے بھی ایک دیں۔“ اس نے اس بے تکلفی سے اپنی ہتھیلی آگے کی جو شاید اس کی طبیعت کا خاصا نمونہ ہے۔ میں نے جھجکتے ہوئے اس کی گلابی اور شگفتا ہتھیلی پہ ایک ٹٹلی رکھی۔

”تھینک یو۔“ وہ بچوں کی طرح خوش ہوتی واپس

پلٹ گئی۔ اس کے بعد یہ اس کا سترہواں سال تھا۔ آئی پانچ سات منٹ رک کے ادھر ادھر کی بے گھر مگر بے ضرر سی باتیں ضرور کیا کرتی۔ میں خاصا خشک مزاج اور لمبے لمبے رہنے والا شخص تھا مگر نبھانے کیوں اس کی لا ابالی سی قدرے شرح گفتگو مجھے بھانے لگی۔ اس کی کھلتی ہوئی مسکراہٹ کی مصومیت مجھے اچھی لگنے لگی۔ اس نے مجھے باتوں ہی باتوں میں اپنے گھر کے کئی چھوٹے بڑے معاملات سے آگاہ کر دیا تھا۔

اس کے والد ایک بھاری قرضے کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ اس کی والدہ کئی ایک بیماریوں کا شکار تھیں اور سب سے چھوٹی بچی کی سیدائش کے بعد تقریباً دو سال سے بستر پہ تھیں اور گھر کا سارا کام کاٹا چھ چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری اس اکیلی تھی۔ بڑھنے کی خواہش رکھنے کے باوجود وہ بمشکل میٹرک ہی کر سکی کیونکہ نہ تو گھر کے حالات نے اجازت دی اور نہ ہی ذمہ داریوں نے۔ بے حد شرر بھائیوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ وہ اکیلی سارے گھر کے کام بھی نمٹاتی تھی۔ یہ سب جاننے کے بعد مجھے اس کے چہرے پہ ہمیشہ کھلی رہنے والی مسکراہٹ اور بھی حیران کن لگی۔

”سنیں، آپ دوپہر کے وقت یوں اکیلی باہر مت نکلا کریں۔“

ایک روز میں نے اسے ٹوکا۔ گرمیوں کی دوپہر تھی، پونے تین کا وقت تھا، گلی تقریباً ”سنسان“ تھی، صرف سامنے ویڈیو گیسر کی دکان میں چند اوباش اور نئے لڑکے جمع تھے۔ میں نے دور سے ندا کو آتے دیکھ کے ان لڑکوں کی حرکتیں نوٹ کر لی تھیں۔ وہ یقیناً ”اس کے اٹھوڑو جود سے آنکھیں سینکنے کے ساتھ ساتھ آوازیں بھی کس رہے تھے جو میں فاصلہ ہونے کی وجہ سے سن نہ سکا البتہ انہیں ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ٹھٹھا لگاتے اور ندا کی جانب اشارے کرنا ضرور دیکھ سکتا تھا۔ ندایا تو واقعی بے خبر تھی یا بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی وہی لاپرواہی تھی، اسی بے فکرے انداز میں اس نے ننھی کو کمر پہ نکار کھا تھا اور

دوسرے ہاتھ سے بھندا کھاتے ہوئے وہ اسدور کی جانب بڑھ رہی تھی۔

”وہ کیوں؟ اب ضرورت دودھ کو پڑے گی تو دودھ سر کو ہی نکلے گی۔ دودھ چاہیے شام کی چائے کے لیے ایسی اٹھنے ہی والی ہوں گی اور اٹھتے ہی انہیں چائے چاہیے ہوتی ہے۔“

”صبح تم بن لینے آئی تھیں تب دودھ بھی لے لیتیں۔“

”دودھ تو صبح صبح گوالا دے جاتا ہے، آدھا کلو دو وقت کی چائے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ یہ پکٹ والا دودھ اتنا منگتا۔ یہ ہم بھلا کب لے سکتے ہیں۔ گرمی اتنی ہے نا جو ڈیڑھ کپ شام کی چائے کے لیے بچا کر رکھا تھا وہ سارا خراب ہو گیا۔ صبح دودھ والے سے کہوں گی پاؤ دودھ صبح دے جایا کرے، پاؤ شام کو۔ کیا کریں ہمارے گھر میں فریج جو نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن کسی چھوٹے بھائی کو بھیج دیا کریں۔ اس وقت تو گھر پہ ہی ہوتے ہوں گے۔“

”کہاں جی، بڑا احسان کرتے ہیں چار گھنٹے اسکول میں وقت ضائع کر کے آتے ہی بیگ پھینکا، روٹی کھائی اور کھیلنے کے لیے نکل گئے گلیوں میں۔“ وہ حسب عادت خود ہی جار کھول کے ایک ثانی سنبھی کو تھمانے کے بعد اب سونف چھالیہ کی پڑیا کھول کے کھا رہی تھی۔

”اور فرض کریں وہ گھر پہ ہوں بھی۔ تو ان سے سودا منگانا نرا کھانے کا سودا ہے۔ لینے نکلیں گے دودھ اور قلانی کھا کے آجائیں گے آپ نہیں جانتے پکے بد معاش ہیں۔“

”لیکن پھر بھی احتیاط کیا کیجئے، اس وقت راستہ خاصا سنسان ہوتا ہے۔“

”راستہ؟“ وہ کھا کھلا کے ہنس پڑی۔

”اک گلی کے فاصلے کو آپ راستہ کہہ رہے ہیں؟ اور پھر مجھے کوئی کھا تھوڑا ہی جائے گا۔ چلیں چھوڑیں ساری باتیں ٹھنڈا پانی تو پلا دیں گلا سوکھ رہا ہے۔“

”آج محمود نہیں آیا۔“ میں نے اپنے ہیپلر لڑکے

کا نام لیا۔

میں صبح گھر سے جو کولر بھر کے لایا تھا اب شام تک چکا ہے۔“ میں نے یہ جاتے ہوئے خاصی شرمندگی محسوس کی۔

”ہائے، ادھر بھی ٹھنڈا پانی نہیں۔“ وہ تکی بھر کے مایوس ہوئی۔

”آج ہمیں بھی آس پڑوس سے کہیں سے بھی برف نہیں ملی۔ اس قدر میتے لوگ ہیں اس ٹٹ کے۔ ہر گھر میں فریج ہے پھر بھی۔ میں تو ترس کے روٹی ہوں ٹھنڈے پانی کو۔ اتنی گرمی میں کہاں حلق سے اترتا ہے گرم پانی۔“ اس کی بات مکمل ہوتے ہوتے میں ٹھنڈی ٹھار پیسی فریزر سے نکل کر اس کے سامنے کھول کے رکھ چکا تھا۔

”نہیں، نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ویسے بھی ہم لوگ ان نخروں کے عادی نہیں، ایسے خرچے۔“

”فکر مت کرو، یہ حساب میں نہیں لکھا جائے مجھ یوں سمجھیں میں آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کر رہا ہوں، آخر اتنی گرم پتی دودھ سر میں کون کسی کا مسلمان بننا ہے۔“ میں نے خلاف فطرت شوخی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

اور پھر یہ معمول بن گیا۔ میں کبھی اس کی تو وضع کو مذ ڈرنک سے کرتا، کبھی آئس کینڈی پیش کرتا۔ پھر جب میں نے بیکری آئنٹمز رکھنا شروع کیے تو وہ بلا تکلف خود ہی کبھی پیسٹری اور کبھی کریم رول نکال لیتی۔ مجھے اس کی ان بے تکلفانہ اداسوں پہ کبھی کوئی غلط گلن نہ گزرا۔

میری شرافت پہ اسے اعتماد تھا، میرے خلوص کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں نے بھی تو کبھی اسے غلط انداز نظروں سے نہیں دیکھا نہ ہی تنہا پا کے کوئی بد تمیزی یا چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی۔ اس لئے شاید وہ میرے ساتھ دوستی کی سطح پر آگئی ہے۔

میں نے سوچا اور دل سے اس دوستی کو تسلیم کر لیا۔ مگر بات ابھی اس بے ضرر دوستی تک ہی محدود تھی

اس سے آگے برہے کے نہ میں نے ارادہ کیا سوچا نہ ہی بلا ارادہ یہ خیال کبھی ذہن میں آیا۔ پھر ایسا کیوں ہوا کہ امی کے سوال پر اس کا معصوم بھولا بھالا چہرہ یکدم نظروں کے سامنے آگیا اور اب ہنسنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔
 ”کیا مجھے باجی کو نذا کے بارے میں بتانا چاہیے؟ یا پھر کچھ دیر اور انتظار کرنا چاہیے۔ پہلے نذا کے دل کا حال جاننا چاہیے، وہ مجھے اس حوالے سے پسند بھی کرتی ہے یا نہیں۔“

گوگو کی حالت میں، میں ساری رات الجھا رہا۔ اگلے دن میں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا، جب شام ساڑھے چار بجے کے قریب وہ آئی تو خاصی تھکی تھکی اور عٹھال لگ رہی تھی۔

”کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟ آج سارا دن ہی کیا کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑی جو چکر نہیں لگا؟“ میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

”ہونہ، ضرورت۔ ہماری زندگی میں وہ دن نجانے کب آئے گا جب ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہ ہوگی۔ صبح سے رات تک ہمارے گھر میں اسی ایک لفظ کی تکرار تو رہتی ہے ضرورت، ضرورت، ضرورت۔“
 وہ آج اکتاتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ اتنا تلخ میں نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا، وہ تو ہمیشہ ہستی مسکراتی رہا کرتی۔

”آج موڈ اتنا خراب کیوں ہے تمہارا؟“ میں نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے اسے آپ کی بجائے تم کہہ کے مخاطب کیا اور ایسا میں نے جان بوجھ کے کیا تھا، لیکن شاید اس نے محسوس ہی نہ کیا۔

”موڈ تو کیا، قسمت خراب ہے میری۔ بالکل ویسے ہی جیسے امی کی طبیعت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ کل رات سے مجھے بھی بخار ہے، لیکن میرا احساس کسی کو نہیں۔ سارے کام روٹین کے مطابق مجھے ہی انجام دینے ہیں، چاہے بخار سے بسمدبک رہا ہو۔ سارے گھر کی صفائی کی ڈھیر کپڑوں کا دھویا، ناشتہ اور پھر کھانا پکایا، اب رات کے لیے چاول لینے آئی تھی۔“

”کوئی دوائی لی؟“ میں نے فکر مندی سے پوچھا۔

”چھوڑ دیں دوائی۔“

میں جمہولتی ایک لٹ کو دلا پٹے کے پیچھے اور بے پروائی سے کہا۔ ”آپ بس آدھا کلو چاول لے دیں۔“

”یہ دو بخار کی گولیاں بھی لے لو۔ اگر رات تک بخار نہ اترے تو ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا۔“ چاولوں کے پیکٹ کے ساتھ میں نے دو گولیاں بھی رکھ دیں۔

”تھینک یو سہام! آپ کتنا خیال رکھتے ہیں سب کا۔“ وہ دلکشی سے مسکرائی۔ اس کے لبوں سے پہلی بار اپنا نام اتنی اپنائیت کے ساتھ سنتا مجھے بے حد اچھا لگا۔

”سب کا تو نہیں۔“ میں نے ادھوری سی بات کی۔
 ”خیر یہ تو آپ یونہی کہہ رہے ہیں۔ آپ ہیں ہی اتنے اچھے۔“ وہ کہہ کے چلتی بنی اور میں اس تبسم سے فقرے میں اقرار کے نئے نئے معنی ڈھونڈتا رہ گیا۔

فاطمہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ گھر جا چکی تھی۔ البتہ خدیجہ باجی ابھی یہیں تھیں۔ مریم کی شادی کی مصروفیات نے امی کو تھکا ڈالا تھا اور کچھ وہ تنہائی کے خیال سے بھی افسردہ ہو رہی تھیں، اس لیے ابن کا ارادہ ابھی کچھ روز اور قیام کا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اب اگر انہوں نے دوبارہ یہ ذکر چھیڑا تو میں بلا توفند نذا کا نام لے لوں گا۔

اگلے دن وہ بتی لینے کے لیے پھر سے موجود تھی۔ ”حساب میں لکھ لیں۔“ اس نے چائے کی پتی کا چھوٹا پیکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ اتنے ماہ میں کبھی اس کے والد ملک صاحب اس حساب کے بارے میں ادائیگی تو درکنار پوچھنے تک نہیں آئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ مگر فی الحال میں اس کے حوالے سے جو خواب دیکھنے لگا تھا ان کے پیش نظر ایسے کاروباری سوال نامناسب اور بے محل تھے۔

”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ وہ کاؤنٹر پر رکھے رسائل کی ورق گردانی کر رہی تھی جب میں نے پوچھا۔ پہلے تو وہ پندرہ پندرہ بیس منٹ تک نہیں کھڑی پڑھتی رہا کرتی تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ

”حمیں رسالے پڑھنے کا بہت شوق ہے؟“ تو اس نے
ابتدا میں سر ہلایا۔

”ہاں بہت مگر میں لے نہیں سکتی۔ ہمارے گھر میں
ایسے شوق عیاشیوں میں شمار ہوتے ہیں۔“

”تو تم یہاں سے لے جایا کرو۔ احتیاط سے ایک
آدھ دن میں پڑھ کے واپس کر دیا کرتا۔“

”تو کیا آپ میگزینز اور ڈائجسٹ کرائے پہ بھی
دیتے ہیں؟“

”ہیں یہ رعایت صرف تمہارے لیے ہے اور
تمہیں بھی کرائے پہ نہیں دے رہا۔“

تب سے یہ اس کا معمول بن گیا۔ کبھی تو رسالے
واقعی جوں کے توں آتے اور میں دوبارہ کاؤنٹر پہ رکھ دیتا
تو وہ بک جاتے مگر کبھی کبھار خاصے بہتر حالت میں
ہوتے۔ اشعار پہ نشان لگے ہوئے، فیشن کے صفحات
میں کاٹ چھانٹ تک ہوئی مگر میں مارے مروت
کے باز پرس نہ کر پاتا۔ یہ احساس تو اب جا کے ہوا تھا کہ
وہ صرف مروت اور لحاظ نہ تھا، پسندیدگی کے جذبات
تھے اس حسن و دلکشی کے آگے میری مرعوبیت تھی۔

”میں نے اپنی باجی سے ذکر کیا تھا تمہارا۔“ میری
اس بات پہ وہ بھرپور انداز میں چونکی۔ اس کی سوالیہ
نظروں کے جواب میں میں نے کہا۔

”وہ۔۔ میں نے انہیں تمہاری طبیعت کی خرابی
کے بارے میں بتایا تھا۔“ جلدی سے میں نے بات
بتائی۔

”کہہ رہی تھیں کہ تمہاری خیریت دریافت کرنے
تمہارے گھر آئیں گی۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ کچھ پریشان سی نظر
آئی۔ ”ویسے بھی آپ کے گھر سے کبھی کوئی ہمارے
ہاں نہیں آیا نہ ہی میں آپ کی باجی کو جانتی ہوں۔“
”مجھے تو جانتی ہوتا۔“ میں اس کی گھبراہٹ سے
مختوظ ہو رہا تھا۔

”ویسے کبھی محلے داری میں ایسے تعلقات بنانے
کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

”لیکن میں اتنی بیمار تو نہیں۔ بلکہ اب تو بالکل

ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ پلیز انہیں منہ کر دیتے۔“
صاف منع کر رہی تھی تو میں نے بھی صاف مناسبات
کرنے کا فیصلہ کیا۔

”تمہاری خیریت دریافت کرنا تو بہانہ تھا۔ اگر تم
اپنے گھر والوں کی وجہ سے گھبر رہی ہو تو بے فکر ہو۔
میں انہیں منع کر دوں گا کہ وہ ایسا کوئی ذکر نہ کریں جس
سے تمہارے گھر والوں کو اندازہ ہو کہ میرے سنے۔ وہ
۔۔ ویسے ہی آئیں گی جیسے کسی بھی لڑکی والے گھر
میں کسی لڑکے کی بہن آتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ تمہارے والدین سے میرے لیے
تمہارا ہاتھ مانگنے آرہی ہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ
واضح انداز میں زور دے کر کہا۔ اس کے چہرے سے
الجھن ہویدا تھی۔

”بات کیا ہے نندا! کیا تمہیں اس پہ اعتراض ہے؟“
وہ میرے سوال پہ صرف مجھے دیکھ کے رہ گئی ان ہی
الجھن بھری نظروں سے۔ اس کی چپ پہ میں نے
موضوع بدلنا چاہا۔

”یہ کریم اور فیس واٹش میں لے آیا ہوں جس کے
بارے میں تم اس دن پوچھ رہی تھیں۔“ میں نے ایک
امپورٹڈ برانڈ کا فیس واٹش اور سن بلاک کریم نکال کے
سامنے رکھی جن کا اشتہار ایک فیشن میگزین میں دیکھنے
کے بعد اس نے مجھ سے ان کی قیمت پوچھی تھی۔
جس طرح وہ دیر تک اس پر کشش اشتہار پہ نظریں
جمائے رہی، اس پہ میں نے اسے یہ دونوں چیزیں تحفے
میں لا کر دینے کا سوچ لیا تھا۔

”لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ اسٹور میں
صرف وہ چیزیں رکھتے ہیں جو اس علاقے میں آسانی
سے فروخت ہو سکیں اور یہ کاسمیٹکس خاصی ہنسی ہیں
اسی لیے آپ نہیں لائیں گے۔“

”ہاں تو میں سیل کرنے کے لیے تھوڑا ہی لایا
ہوں۔ تمہارے لیے صرف اور صرف تمہارے لیے
خریدے ہیں۔“

”نہیں یہ میں نہیں لے سکتی۔“ وہ کچھ ہچکچائی۔

بہو ہن ان کی قیمت لی دے سے تھی۔
 وہ دوسرے لیے لیا ہوں اور تم ہو کہ نخر
 روری ہو۔ تمہیں پس و پیش کے بعد وہ ملن گئی۔ اپنی
 نئی مٹی پتلیں پٹ پٹاتے ہوئے اس نے کچھ اس ادا
 سے میرا سر یہ ادا کیا کہ میں گویا اندہی ہو گیا۔

ابھی میں ہواؤں میں اڑ رہی رہا تھا کہ انکل غفار کا بیٹا
 اور بس وہاں چلا آیا۔ اس کے گرجوشی سے کیے سلام کا
 جواب میں سرسری سے انداز میں اس لیے دے پایا کہ
 میری نظریں تو اب تک گئی کے اس کو نے میں گئی
 تھیں جملہ وہ واپس جاتے ہوئے نظر آ رہی تھی۔ دل
 چاہ رہا تھا کہ کبھی نظروں سے اوچھل نہ ہو۔ اور بس نے
 میری نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

”رے یہ تو وہی مفت خوروں کی لڑکی ہے، ہاں لگتی
 تو ویسی ہے۔ اب اس محلے میں آچکا ہے ملک۔“ اس کی
 بات پہ میں ٹھٹک کر غور کرنے لگا کہ آخر وہ یہ کیا
 کچھ اس کر رہا ہے جبکہ وہ اپنی کہہ چکنے کے بعد اب مجھ
 سے اسٹور کی آمدنی وغیرہ کے بارے میں دریافت کر رہا
 تھا۔

”کیا کیا کہہ رہے تھے تم ابھی؟“

”میں نے پوچھا ہے یار کہ یہ اسٹیشنری وغیرہ سے
 کتنا پرافٹ ہو جایا کرتا ہے؟ اگر منافع بخش ہے تو میں
 بھی اردو بازار کا ایک چکر لگا لوں۔ کچھ پھنسلوں
 کاپیاں رجسٹر لاکے رکھ لوں۔“

”نہیں، جو تم پہلے کہہ رہے تھے، ملک صاحب کی
 بیٹی۔ میرا مطلب ہے ملک صاحب کے بارے میں تم
 نے کیا کہا؟“

”ہاں یار یہ ملک پہلے ہمارے ہی محلے میں رہتا تھا۔
 بڑا ذلیل کر کے تھا اس کو مالک مکانوں نے کئی مہینے کا
 کرایہ کھا گیا، وہ بھی بڑے بڑے تھے، نہ فرنیچر نکالنے دیا
 نہ ہی چھت سے پتھے اتارنے دیے تاکہ کچھ تو کرایہ
 پورا ہو۔ اس پڑوس سے کئی ہزار ادھار الگ لے رکھا
 تھا، وہ بھی دینے سے صاف مکر گیا۔ بڑا دلیر انسان ہے
 بھی، بلکہ ڈھیٹ اور بے غیرت پیسے لے کر صاف مکر
 جاتا ہے۔ اوپر سے اس محلے کے تقریباً سبھی

دکانداروں سے ادھار سدا لے رکھا تھا۔ میری اپنی
 دکان پہ اس کا تھ سات ہزار کا حساب باقی سبب نہیں
 نے بھی دکھا، تمہیں کھول لیا ہے۔“

”آں۔ ہاں مگر میرے پاس تو بہت سے لوگوں کے
 کھاتے ہیں۔ اکثر مستقل کابک ادھار سامان لیتے
 رہتے ہیں۔“

”مگر وہ مہینے کے مہینے حساب پکا بھی تو دیتے ہوں
 گے۔ تم کالی کھول کے بتاؤ کب کھاتا کھلا اور اب تک
 کتنی ادا کی ہوئی۔“ مگر میں ایسا نہ کر سکا کیونکہ اب
 تک میرے اسٹور سے اس گھر تک جانے والے کسی
 سامان کی ادا کیگی نہ ہوئی تھی۔

”یہ ہیں ہی ایسے بھوکے منگے لوگ۔ بچوں کی
 تربیت بھی ایسے ہی کی ہے۔ بڑا جہاں ملازم ہوتا ہے،
 ہاتھ کی صفائی دکھا کے بھاگ جاتا ہے۔ چھوٹے اسکول
 جانے کے بجائے چوراہوں پہ کھڑے ہو کے اکثر چندہ
 اکٹھا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جوان لڑکی کو دکان دکان
 سے سودا جمع کر کے لانے پر لگا رکھا ہے۔“

”تمہیں کوئی غلط قسمی تو۔“ صدے کی شدت
 سے میں جملہ تک مکمل نہ کر پایا تھا۔

”نہیں یار! خود میری دکان میں بڑا مسکرا مسکرا کے
 آتی رہی۔ مجھے لڑکیوں سے کوئی پرہیز تو نہیں لیکن
 دکانداری کے معاملے میں، میں استاد ہوں میرے ابا تو
 اکثر کہتے ہیں تجھ میں کسی ہندو نہیں کی روح ہے۔ اس
 لیے جہاں بات لینے دینے تک آئی میں نے صاف ہری
 جھنڈی دکھا دی۔ کھاتا بھی اسی وقت بند کر دیا جب
 ڈیڑھ مہینے بعد بھی اس کا باپ دکان میں جھانکنے تک نہ
 آیا۔“

البتہ خیاری والا برا پھنسا، الو بنا کے خوب سامان
 اکٹھا کرتی رہی۔ وہ تو جب اس کے باپ نے خبر لی تو
 اچھی چھتروں کی بیٹی کی۔ جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہو چکا
 مگر بے چارے کے زخمی دل سے ناکام عشق کی آہیں
 اب بھی نکلتی ہیں۔“

اور بس نے قہقہہ لگایا۔ میرے گم صم انداز کو اس
 نے میری غیر دلچسپی یہ محمول کیا اور ادھر ادھر کی باتیں

درزی کی دکان سے میں نے نذا کو لکھتے دیکھا اس کے ساتھ ایک اور نوجوان لڑکی اور گود میں ننھی تھی۔ میں اسے چاہنے کے باوجود متوجہ نہ کر پایا کہ اس طرح ہر راہ اسے مخاطب کرنا خاصاً بیوقوف لگا۔ میں اپنے رستے پہ جانے ہی والا تھا کہ وہ دونوں ایک وہی بڑے چاٹ اور ملک شیک والی پھول سی دکان کے اندر داخل ہو گئیں۔ مجھے جانے کیا خیال آیا کہ میں بھی پیچھے پیچھے چل پڑا۔

”اندر بیٹھ کے بات کرنا اتنا بھی نامناسب نہیں لگے گا۔ لیکن پتہ نہیں یہ لڑکی کون ہے۔ اس کی کوئی کزن وغیرہ۔ اور پتہ نہیں نذا اس کے سامنے مجھ سے بات کرنا گوارا کرتی ہے یا نہیں۔ چلو اندر تو چلتا ہوں۔“

میں یہ سوچتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ دو تین لکڑی کے بیچ رکھے تھے ایک جانب پرہ کھینچ کے لیڈیز کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ وہ یقیناً پردے کے پیچھے رکھے بیچ بیٹھ گئی تھی اور اب مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی میں پردے کے بالکل نزدیک والے بیچ بیٹھ گیا تاکہ جیسے ہی وہ باہر نکلے اس کی پہلی نظر مجھ پہ پڑے۔

”کیا لے گی نذا؟ مہنگو ملک شیک ٹھنڈی پیسی یا چاٹ۔“

”جو بھی تو کھلا دے۔ میں تو تیری مہمان ہوں۔“

”ارے میں تو خود مہمان ہوں۔“ وہ لڑکی کھل کر ہنسی۔ ”میری طرف سے سب کچھ منگوالے۔ صدق انکار تھوڑا ہی کرے گا۔ میری سہیلی بھی اس کی مہمان ہی ہوئی۔“

”اچھا پھر دو پلیٹ چاٹ کے ساتھ بوتلیں منگا۔ بعد میں ملک شیک بھی پیسے گے گھر جا کے وہ پتلی مونگ کی دال تو نہ کھانا پڑے گی۔“ اس کی بے تکلفانہ فرمائش پہ میں ٹھٹک گیا۔

”تو کہے تو چاٹ کے ساتھ دو برگر بھی منگالوں۔ صدق نکلوالی برگر کی دکان سے منگا دے گا۔“

”سچ تیرے تو عیش ہیں بلی۔ بڑی واقفیت پیدا کی ہے پہلے اس درزی سے مفت کاجوز اسلوا یا آب اس

کرنے لگا جو میں نے اسی غائب ماغی سے سنیں میری ساری حیات تو ابھی تک اس کی پہلے والی ہرزہ سرائی میں انہی تھیں۔ میری ہوں ہاں سے تنگ آکر وہ جلد ہی چلا گیا۔ مجھ سے بھی اب مزید وقت یہاں گزارنا مشکل ہو رہا تھا میں نے خلاف معمول سرشام ہی اسٹور کے سڑگرائے اور گھر واپس آ گیا۔ باجی اور امی نے پوچھا تو میں نے اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا۔

”ہائے ہائے اللہ خیر کرے۔ اسے تو ہلکا سا زکام بھی ہو تو ہفتے لگ جاتے ہیں ٹھیک ہوتے ہوتے۔“ امی نے سنتے ہی ہوا ویلا مچا دیا۔ مجھے آکٹا ہٹ سی ہوئی۔ ”ایسا کچھ نہیں ہے امی! ذرا سا سر میں درد ہے اور کوئی خاص بات نہیں۔“

اس سے پہلے کہ وہ سردرد کے لیے کچھ اور ٹوٹکے آزما میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ بند دروازے کے پیچھے سے باجی کی آواز سنائی دی۔

”بوجی بھی آپ کو ساری عمر یہی سمجھاتے رہے امی! کہ رضا کو ننھے بچوں کی طرح سمجھنا چھوڑ دیں وہ چڑجاتا ہے اس برتاؤ سے۔“

”چڑتا تو وہ ہر چیز سے ہے دن بدن چڑچڑا ہوتا جا رہا ہے۔“

”اس کی شادی اب کروا ہی دیں امی! مجھے یقین ہے یہ ٹھیک ہو جائے گا بلکہ یوں کہیں سدھ جائے گا۔“

صبح تک میں نے سوچا تھا کہ دوبارہ یہ ذکر چھیڑنے پہ میں ان سے نذا کا تذکرہ کروں گا، لیکن اب اور لیس کی باتوں نے مجھے اس بری طرح الجھایا کہ میں ایسا کرنے کا سوچتے ہوئے بھی ہچکچا رہا تھا۔ ایک طرف یہ خیال آتا کہ اور لیس کو کون سا ملک صاحب یا نذا سے ذاتی پر خاش سے جو وہ بے بنیاد بہتان باندھے گا۔ دوسری طرف نذا کی معصومیت ان الزامات پہ یقین کرنے سے روک رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اور لیس سے مل کر تفصیلی گفتگو کے ذریعے تصدیق کرنے کا سوچا۔

اگلے دن محمود کو اسٹور پہ بٹھا کے میں پیدل ہی اور لیس کی دکان کی جانب چل پڑا۔ جب بازار میں ایک

ہو بل والے سے پیٹ پوجا۔ اس کے لہجے میں
رکھ دھند نمیاں تو۔

”صرف سلائی ہی مفت نہیں ہوئی، اچھرے کی
دکان سے یہ لان کا ڈھائی سو والا جوڑا ملا بھی مفت ہی
ہے وہ بابا تو لٹو ہے مجھ پہ۔ یہ تو ہی بدھو ہے۔“

”یار کیا کروں ہمارے۔ بازار میں ایسی دکانیں ہی
نہیں۔ لے دے کر چند کرنا۔ کی دکانیں ہیں ان میں
بھی بڑھے کھوسٹ۔ ہاں ایک برتا ہے وہ رضا پیر
اسٹور والا۔“

میرا دواں دواں سلگ اٹھا۔

”وہ بھی اوقات سے بڑھ کے خواب دیکھنے لگا۔ بھئی
ذرا ہنس بول لیا، مسکرا کے دیکھ لیا، اسی یہ شکر
کہ ورنہ کون لڑکی اس کو ڈو کے پاس دو گھڑی گھڑے
ہونا گوارا کرے۔ لیکن ناں جی۔ چارو تلیں پلا کے
دو ٹافیاں کھلا کے وہ تو گھر بسانے کے خواب دیکھ رہا
ہے۔ بڑا دیدے منکا منکا کے کل کہہ رہا تھا۔“ میری
باجی آپ کا ہاتھ مانگنے آئیں گی۔“ وہ لہجہ بگاڑ کے بولی۔
ٹھنڈے مشروب کا گھونٹ میرے حلق سے تیزاب کی
طرح گزرا۔

”تو آنے دے اس کی باجی کو۔ کیا پتہ بات بن
جائے ویسے بھی تو خود تنگ ہے اپنے گھر کے حالات
سے۔ اچھا ہے کسی بہانے یہاں سے نکل جائے گی
جہاں ذرا ذرا اسی چیز کے لیے ترنا پڑتا ہے، ٹکے ٹکے
کے لوگوں کو منہ لگانا پڑتا ہے اور اگر کسی طرح بغیر ہاتھ
پیر مارے مجھے بے فکری کی زندگی مل رہی ہے تو کیا برا
ہے۔“

”تو بے گھر کے حالات سے تنگ ضرور ہوں مگر
قسمت سے اتنی مایوس بھی نہیں کہ یہ گھائے کا سودا
کر لوں۔“

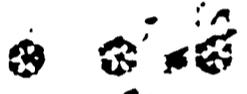
”گھائے کا سودا؟ اکلوتا ہے کاروبار چلتا ہوا ہے اور
سنا ہے پڑھا لکھا بھی ہے ورنہ یہ دکاندار تو چند جماعتیں
پاس ہوتے ہیں۔“

”اس کی پڑھائی لکھائی کو جاننا ہے کیا مجھے۔“

بگڑ کے بولی۔

”تو نے دیکھ تو رکھا ہے اس ڈھائی نئے کو، پھر مجھ
مجھے ایسے مشورے دے رہی ہے یہ ہے تیرا دوستی۔
اتنا جگرا ہے تو خود شادی کر لے اس بونے کے ساتھ
دیدے دیکھے ہیں اس کے، مینڈک جیسے سمٹے ہوئے
مجھے اپنا مذاق نہیں بنوانا مسز کو ڈون کے۔“

”تو تو ناراض ہی ہو گئی یار! میں نے تو مذاق کیا تھا
ورنہ اگر ذرا عقل سے کام لے تو اتھے اتھے تیرے گھر
رشتہ بھیجے یہ تیار ہوں۔“ اس امید افزا پیش گوئی نے مذا
کا کیا رد عمل تھا، یہ جاننے کی زحمت کیے بغیر میں تیزی
سے وہاں سے نکل گیا۔



اور یہ میری عمر کا اسی سال ہے
تیسری دہائی کا آخری سال۔

اس سال تک پہنچتے پہنچتے بہت کچھ بدل گیا ہے۔
میری ذات میں بھی اور میری زندگی میں بھی۔ اگر کہیں
کوئی تبدیلی نہیں آئی تو وہ میرا سراپا تھا۔ ابھی تک ویسے
کا ویسا۔ ویلا پتلا، منحنی سا، چار فٹ ڈیڑھ انچ قد والا،
چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیروں والا۔

ہمارا گھر ابھی بھی وہی البتہ اسٹور اب وہ نہیں رہا۔
نزدیکی مارکیٹ میں مننے والے نئے شاپنگ پلازہ میں لا
سال پہلے میں نے اکٹھی چار دکانیں گراؤنڈ فلور پہ خرید
لیں۔ یہ میرے اسٹور پہ صرف تین سالہ محنت کے
نتیجے میں جمع کئے سرمائے کی بدولت ممکن ہوا۔ میرا
کاروبار دن بدن ترقی کر رہا تھا اور اخراجات نہ ہونے
کے برابر تھے۔ پھر بھی ترقی کی دھن تھی جو سر پہ سوار
تھی۔ آگے بڑھنے کا جنون تھا جو شاید ابوجی کی ادھوری
خواہشات کے احترام میں میرے اندر پیدا ہوا۔ ان چار
دکانوں کو میں نے ایک جدید شاپنگ سینٹر کی شکل دے
دی سات آٹھ ور کرز۔ مشتمل اسٹاف رکھا جس میں دو
سیلز گرلز بھی شامل تھیں۔ کاؤنٹر پہ کمپیوٹرز موجود
تھے۔ فل ایئر کنڈیشنڈ اسٹور جلد ہی علاقے بھر میں اپنی

اب بھی وقت ہے میری بات مان لو، کرلو شادی۔ میری بھی پریشانیاں ختم ہوں۔ امی کی مدح کو بھی سکون مل جائے۔ ایک جائز، مستحسن عمل بلکہ سنت نبوی ہے۔ تمہارے دین و دنیا دونوں سنور جائیں گے۔“

”ایک شادی۔ اور اتنے فائدے۔“ میں مذاق اڑاتا۔ ”چلیں میری تو دنیا اور دین دونوں سنور جائیں گے اور وہ اس کا کیا ہو گا جسے آپ یہاں بلائیں گی؟“

”ہونا کیا ہے، عیش کرے گی۔ لڑکیاں ترستی ہیں ایسے سسرال کے لیے جہاں ایسی روک ٹوک سے آزاد بالکل بادشاہت والی زندگی ہو۔ رانی بن کے راج کرے گی آنے والی۔ ہم بہنوں کا کیا ہے پہلے ہی سالوں بعد چکر لگاتی ہیں نہ ساس نہ سسر اور آج کل کی لڑکیوں کو کیا چاہیے۔“

”بہت کچھ۔ بلکہ سب کچھ۔“ مجھے بہت سی باتیں یاد آگئیں۔

”تو تم میں کیا کمی ہے؟“ انہوں نے انتہا ہی کر دی۔ میں گھائل نظروں سے انہیں دیکھ کے رہ گیا تو وہ نظریں چرا گئیں۔

”ماشاء اللہ لاکھوں کماتے ہو، شریف ہو، اور اتنے تعلیم یافتہ بھی۔“

”تو تعلیم کو چاٹنا ہے کیا؟“ ایک تیز آواز نیزے کی طرح سماعتوں کو چھید گئی۔

”وہ بونائے کون لڑکی اس کو ڈو کے پاس دو گھڑی کھڑے ہونا گوارا کرے۔“ وہ حقارت۔

”مجھے اپنا مذاق نہیں بنوانا، اس ڈھالی فٹے کی مسز کو ڈوبن گے۔“

”مجھے اپنا مذاق نہیں بنوانا۔“ ایک لخت میں چلا اٹھا۔ باجی نے حیرت سے مجھے دیکھا اور چپ ہو گئیں مگر یہ خدیجہ باجی تھیں، میرے ساتھ سرگھپانے والی، میرے لاڈ اٹھانے کے ساتھ ساتھ بچپن سے میری اونچی آواز اور ہلکی پھلکی بد تمیزی بھی مسہد جانے والی، میری تند و تیز باتیں اور بحث سن کے لی جانے

ساکھ قائم کر چکا تھا۔

صالہ باجی کے ساتھ ساتھ اب مریم سے بھی واسطہ فون کالز تک محدود ہو کے رہ گیا، البتہ فالٹو اور خدیجہ باجی آتی جاتی رہتی تھیں۔ خصوصاً امی کی وفات کے بعد تو خدیجہ باجی ہفتے میں دو تین بار میری خاطر آئیں ہاں امی۔ یہ تب کی بات ہے، ان ہی دنوں کی، جب ندا کی جانب سے ملے زخم کو میں سب سے چھپانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ابو جی تو کتنا ہی عرصہ بیمار رہے تھے لیکن امی اچانک چپ چاپ بغیر کسی وجہ کے مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد اب مجھے کسی چیز میں دلچسپی نہ رہی تھی، خود اپنے آپ تک میں نہیں۔ بس جینے کو کوئی تو بہانہ چاہیے تھا، سو خود کو اس پراسٹور میں مصروف کر لیا۔ دو سال سے اب یہی مصروفیت ہے۔ اس کے لیے نئے نئے آئیڈیاز سوچنا، نئے نئے ڈھنگ سے اس کی آرائش کرنا ان سب کے ساتھ ساتھ خدیجہ باجی کا اصرار بھی جاری و ساری رہا۔

”شادی کر لو، گھر سالو۔“

ہر بار ان کے مشورے پہ مجھے ندا کے زہر خند لہجے میں ادا کیے وہ تحقیر آمیز فقرے یاد آجاتے اور میں نئے سرے سے سلگ اٹھتا۔

”آپ مجھے خود کشی کرنے کا حکم دے دیں، میں کر گزروں گا لیکن خدا کا واسطہ ہے شادی کرنے کا نہ کہیں۔“ میں ہاتھ جوڑتا تو وہ توبہ توبہ کرنے لگتیں۔

”خیر کی بات منہ سے نکالو رضا! جو دل میں التاسیدھا آتا ہے بک دیتے ہو، میری توبہ جو آئندہ تمہیں شادی کا مشورہ دیا۔ کم از کم یہ بکو اس تو نہ سننا پڑے گی۔“ مگر ان کی توبہ بس اتنے دن تک قائم رہتی جتنے دن وہ اپنے گھر میں رہتیں، چار دن بعد جب دوبارہ آئیں، میرے پہلے کپڑے استری کر کے الماریوں میں ہنگ کرتے ہوئے، فرنگ میں دو تین طرح کے کھانے بنا کر فریز کرتے ہوئے وہ کی بربرہالی رہتیں۔

”شاید خدا نے مجھے اسی لیے اولاد نہیں دی ورنہ ان کو پاتی یا تجھے سنبھالتی، تو تو لاوارث ہو کے رہ جاتا۔“

دلیل وہ چپ ہو سکتی تھیں مگر صالحہ باجی نہیں۔ اس بار ان کے ساتھ مریم بھی آئی۔ اپنی شادی کے بعد وہ پہلی بار آئی تھی اور امی کے جانے کے بعد تو دونوں کا ہی پہلا چکر تھا پاکستان کا۔ کئی دن انہیں یاد کر کے روتی رہیں دونوں۔ ذرا سنبھلیں تو وہی خدیجہ باجی والا مطالبہ۔

”یکینہ شد و شد۔“ میں زنج ہو گیا۔

”لو، تم تو بہنوں کی تعداد بھی بھول گئے، ہم دو نہیں چار ہیں۔“

”اور چار کی ایک ہی زبان ہے، ایک ہی ڈیمانڈ ہے۔“

”ارے کیا تم لوگ اس کے منت تر لے کر رہے ہو صالحہ باجی نے تینوں کو ڈپٹا۔ یہ کیا ہم سے اتنا بڑا ہو گیا؟ میں اس کے کلن پکڑ کے سیدھا مولوی کے آگے بٹھا سکتی ہوں، اتنا حق ہے میرا۔“ میں بلبلا اٹھنے کے باوجود ان کے استحقاق کو جھٹلانے کی ہمت نہ کر سکا۔

”تو پھر دیر کس بات کی ہے باجی!“ مریم نے انہیں مزید برہا اور دیا۔

”لڑکی ملنے کی۔ جیسے ہی کوئی معقول لڑکی ملی بس سمجھو رضا قابو آ گیا۔“

میں نے بھی سوچا، انہیں اپنی سی کوشش کر لینے دو۔ کہاں سے ڈھونڈیں گی ایسی لڑکی جو مجھ سے شادی کرنے پر یہ بھی تیار ہو، اور معقول بھی ہو۔ ان دنوں میں ندا کی وجہ سے حد سے بڑھی خود ترسی کا شکار تھا۔ مجھے اپنی کوتاہ قاستی کا احساس بچپن سے تھا اور یہ احساس ہمیشہ ناخوشگوار ہی رہا۔ اس احساس نے ہمیشہ مجھے دکھ اور محرومی دی مگر میں خود سے نفرت نہ کر سکا تھا۔ میری ذات خود اعتمادی سے محروم تھی مگر خود ترسی کا شکار اسے ندانے بنایا تھا۔ ایک بالکل عام سی سسطھی سی لڑکی جو سستی خواہشات کے زیر اثر اپنی اتا اور خودداری کو طاق پر رکھتے ہوئے، اپنے نسوالی وقار اور حیا کو بس پشت ڈالتے ہوئے ہر جائز، ناجائز قدم اٹھانے پر تیار تھی اسے بھی میرا ساتھ گوارا نہ تھا پھر کسی اچھی اور

معقول لڑکی کو کیا ضرورت تھی کہ وہ بغیر کسی مجبوری کے مجھے اپنائے۔ یہی سوچ کے میں نے انہیں خوش پوری کرنے کی اجازت دے دی۔

”ہمارے رضا کو لڑکیوں کی کیا کمی؟“ خدیجہ باجی کے کہنے پر صالحہ باجی نے انہیں ہلکی سی سرزنش کی۔

”مفضول باتیں مت کرو خدیجہ؟ حقیقت پسند بنو۔“

میں اندر اپنے کمرے میں جا چکا تھا اس لیے باجی ”حقیقت پسندی۔“ یہ اتر آئیں یہ جانے بغیر کہ میں ذرا سی کوشش کے بغیر کمرے میں بیٹھا بھی ان کی باتیں سن سکتا ہوں۔

”وہ ہمارا بھائی ہے اس لئے ہمیں پیارا ہے مگر مت بھولو کہ وہ۔“ حقیقت پسندی کا دعوا کرنے کے باوجود وہ بات مکمل نہ کر سکیں۔

”بے شک اس میں ایک اچھا شوہر اور داماد بننے کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ اس کا کردار بے داغ ہے، اخلاق و سیرت بے مثال ہے، صاحب جائیداد اور برسر روزگار ہے، تعلیم یافتہ بھی ہے لیکن ظاہری طور پر میرا مطلب ہے جسمانی لحاظ سے اس میں جو کمی ہے

اسے تم لوگ نظر انداز مت کرو۔ اس کی وجہ سے ہمیں رشتہ تلاش کرنے میں مشکل بھی ہو سکتی ہے اور وقت بھی لگ سکتا ہے۔“

”تو کیا ہم رضا کی شادی کے خواب دکھنا چھوڑ دیں۔“ قاطمہ نے گھبرا کر کہا۔

”کیوں؟ کیوں نہیں ہو سکتی اس کی شادی۔ اللہ نے سب کا جوڑ بنا رکھا ہے۔ اس کے نصیب میں بھی یقیناً کوئی اچھی سی لڑکی ہوگی، اس نے زندگی میں کب کسی کے ساتھ برا کیا ہے جو اس کے ساتھ برا ہو۔ تم نے سنا نہیں نیکو کار مردوں کے لیے اللہ پاک نے نیکو کار عورتیں منتخب کر رکھی ہیں۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ بھالی منتخب کرتے ہوئے دھوکا نہیں کھانا اور نہ ہی کسی خوش فہمی کا شکار ہو کے اونچے اونچے خواب دیکھنے ہیں۔ شرافت اور سیرت ہماری اولین ترجیح ہونی

شکار ہو کے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ مجھے تمہارا یہ تصور سمجھ میں آیا تھا اور میں تمہیں اس میں حق بجانب بھی جانتی تھی۔ واقعی اگر کوئی نارمل لڑکی تمہارے رکھ رکھاؤ، جائیداد، یا پھر تعلیم یا تمہاری علوتوں وغیرہ سے متاثر ہو کے تم سے شادی کر بھی لیتی تو کیا پتہ کتنا عرصہ یہ پسندیدگی برقرار رہتی۔ ظاہری کشش اور خوبصورتی سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر خود کسی کے دل میں یہ احساس نہ بھی ہو تو دنیا اس احساس کو جگانے میں پیچھے نہیں رہتی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اچھے دل کی۔ عمدہ ذہن والی لڑکی تمہیں اس خالی کے ساتھ صدق دل سے اپنا لیتی مگر یہ لوگ دنیا والے کچھ ہی عرصے میں طنز اور طعنے دے دے کر اسے اس فیصلے کو غلط سمجھنے پہ مجبور کر دیتے۔ اگر تم اس احساس سے بچنا چاہتے تھے تو میں بھی تمہیں اس دکھ سے بچانا چاہتی تھی اس لیے زینب کو دیکھ کے خیال آیا کہ وہ ایسی لڑکی ہے جس کی تمہیں ضرورت نہ ہو، مگر اسے تمہاری ضرورت بہر حال ہے۔ وہ تمہارے ساتھ صرف خوش ہی نہیں رہے گی بلکہ قسمت کی اس مہربانی پہ نازاں بھی ہوگی۔

”لوگ تو اب بھی چپ نہ بیٹھیں گے باجی! ہمارا داخلہ کئی بار ہوتے ہوتے رہ گیا۔ آپ دیکھیں اب بھی کتنا کمزور ہے۔ آپ یقین کریں، زسری کلاس کے بچوں میں گھل مل جائے گا۔“

”ہوں۔۔۔ یو آر رائٹ۔۔۔ پھر بھی میرا مشورہ ہے آپ اس کی عمر دو سال کم لکھوائیں۔ آگے چل کر اس بچے کے لیے آسانی رہے گی۔ ویسے اتنا بتا دوں، مجھے اس کائیسٹ اور انٹرویو لینا پڑے گا۔“

شاید انہیں یقین نہیں ہو گا کہ میں ذہنی طور پر اس قابل ہوں بھی یا نہیں کہ ان کے اسکول میں چل سکوں۔ لیکن میں نے انٹرویو میں پوچھے گئے سوالوں کے جوابات خود اعتمادی سے دیے۔ یوں میرا ایڈمیشن چھ سال کی عمر میں زسری کلاس میں ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

جے میں صرف سوا گھنٹہ قبل بیاہ کے لایا تھا۔ وہ میرے ہی جیسی تھی۔ اتنی ہی مکمل، جتنا کہ میں۔ اور اتنی ہی نامکمل جتنا کہ میں۔ اس کا قد تو شاید مجھ سے بھی ڈیڑھ دو انچ کم تھا۔ میں پھوڑے کی طرح دکھتے دل کے ساتھ چپ چاپ سارے ہنگامے چھوڑ کے ٹیرس پہ چلا آیا۔ وہاں کی سب لائٹیں آف تھیں۔ میں اندھیرے میں کھڑا رخصت ہوتے مہمانوں کو دیکھ رہا تھا اور اندازے لگا رہا تھا کہ اس ”بے مثال کپل“ سے متاثر ہو کر کس کس نے۔۔۔ کن کن الفاظ میں مدح سرائی کی ہوگی۔

”یہاں کیوں کھڑے ہو رضا!“ بالاخر صالحہ باجی نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ میں نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ پتہ نہیں اس سے انہیں میری نظروں میں کیا نظر آیا۔ گلے، شکوے، فریاد۔۔۔ نجانے کیا کچھ کہ وہ پہلی بار میرے سامنے گڑبڑا کے نگاہ جھکانے پہ مجبور ہو گئیں۔

”کیوں کیا باجی آپ نے ایسا۔ بتائیے، کیوں کیا آپ نے مجھے آپ سے کم از کم آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔“

”میں نے تو۔۔۔ انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کہہ نہ سکیں۔“

”آپ نے مجھے مکمل طور پہ تماشا بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

”میں نے تمہارے لیے بہتر سوچا۔“

”بہتر، یہ بہتر ہے باجی! کچھ تو انصاف سے کام لیجئے۔“

”تو تم کیا توقع کر رہے تھے رضا! میں تمہارے لیے سرو قد، صحت مند حور پری ڈھونڈ کے لاتی۔“ انہوں نے سفاکی کی انتہا کر دی۔ میں قدرے لاجواب ہو کے چپ ہو گیا۔ غصے کے مارے یہ بات وہ کہہ تو چکیں مگر اب خود اپنی بات کی سنگینی پہ خائف نظر آرہی تھیں۔

”رضا! میرے بھیا! تیری باجی تیرے لیے غلط فیصلہ کیسے کر سکتی ہے۔ تم ہی بتاؤ، تم شادی سے اس لیے کترار ہے تھے تاکہ تم احساس کمتری اور مرعوبیت کا

اور یہ میری عمر کا نوواں سال تھا۔ نہیں، نہیں، گیارہواں یا ساٹواں نہیں بلکہ حقیقتاً "نواں سال۔" کپل دنیا کے لیے ایک مذاق بن جائے گا۔ باتیں تو اب بھی سنتا پڑیں گی۔"

"مگر یہ باتیں کچھ دن تک تم دونوں کو صرف ملول ہی کریں گی، دلوں میں فاصلہ تو پیدا نہیں کریں گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے، اپنے اپنے دکھ درد بانٹتے ہوئے، تم دونوں کو یہ سب سنائی ہی نہ دے۔ تم ایک دوسرے کی رفاقت میں اتنے کھل مل جاؤ کہ دنیا کو ہی بھول جاؤ۔" وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ دبا کر بولیں۔ یہ سہانا خواب دکھانے پہ میں نے ممنون نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

اسی خواب کی ڈور تھام کے میں نئے سرے سے خود کو حوصلہ دلاتا اپنے کمرے میں گیا۔ بیڈ کے ایک سرے پہ گٹھری سا بناوہ مختصر سا وجود میرے اندر نئے جذبات جگا گیا۔ میں نے آستکی سے گھونگھٹ الٹا۔ اس کا چھوٹا سا گول چہرہ بے پناہ معصومیت اور پاکیزگی سمیٹے ہوئے تھا۔ صاف گندمی رنگت والے عام سے نقوش کے حامل اس چہرے پہ بے حد خاص آنکھیں تھیں۔ جیسا بوجھل، کشادگی اور وسعت سمیٹے گہری سیاہ چمکتی، لانی پلکوں والی پرکشش آنکھیں۔ اس کا ننھا سا گدرا یا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ میں سما گیا اور میں نے اسے وہ برسٹلٹ پنا دیا جو بڑے شوق سے منہ دکھائی کے لیے خرید آ گیا تھا۔

اگلے روز ویسے کی تقریب کے لیے تیار ہوتے ہوئے میں کل والے احساسات کو بالکل فراموش کیے ایک بار پھر سینکڑوں لوگوں کا سامنا کرنے کے لیے خود کو اعتماد سے عاری محسوس کر رہا تھا۔ اس سے میں میں نے خود کو حد سے زیادہ لاچار اور بے بس محسوس کیا تھا۔

"بابی! یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔" میں ایک بار

پھر وہی شکایت لے کر ان کے روبرو تھا۔ "زیادہ ہو کے مجھے دیکھنے لگیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔" "اتنا سمجھانے کے باوجود؟" یوں بھی صبح اٹنے کے بعد مجھے منگن و منگن دیکھ کر وہ خاصی ڈوڑھ تھیں۔

"رضا! میں کیا کروں تمہارا۔" وہ جیسے زنی ہو گئیں۔

"میں اپنے آپ کو سنبھال کے دوسروں کے ہاتھ تھیک سے بچا بچا کے تھک چکا تھا۔ آپ نے مجھے ایک اور وجود کی شرمساری میں سمجھی حصہ دار بنا دیا۔ میں اپنے حصے کے مذاق سمیٹتا اب اس کے حصے کی شرمندگی کا بوجھ بھی اٹھاؤں۔"

"شرمندہ تو تمہیں ہونا چاہیے رضا! مگر اپنے ہونے نہیں، اپنے ان الفاظ پہ شرم کرو۔ ابو جی کی محبت اور تحرو مان یاد کرو، امی کے وہ شکرانے کے نفل یاد کرو جو

تمہاری ہر سالگرہ پہ ساری ساری رات باند کرنا تھیں۔ ہم بہنوں کو ہی دیکھو جو اتنے غور سے تمہیں بھیا کہہ کر پکارتا ہیں۔ تم نے تو ہمارے پیار کو مٹی میں ملا دیا۔ ابو کے شر سے تنے سینے اور اٹھے ہوئے سر کو جھکا دیا۔ تم۔ تم۔ رضا! خود کو ایک بوجھ کہہ رہے ہو، اپنے ہونے پہ شرمساری محسوس کر رہے ہو۔ زینب سے نفرت اور کراہیت کا اظہار کرنے کا مطلب ہے کہ تم اپنے آپ سے کراہیت محسوس کر رہے ہو۔

"نہیں بابی۔" میں تڑپ اٹھا۔

"رضا! جب تک تم خود اپنے آپ کو تعظیم نہیں دو گے، دوسرا کوئی کیا دے گا؟ جتنی محبتیں تمہیں حاصل ہیں ان پہ قانع۔ بلکہ مغرور ہو جاؤ تو دنیا والوں کا گریزدکھ نہیں دے گا۔

کیا تم اس معصوم لڑکی کو نہیں چاہ سکتے، اس خالی کے باوجود۔"

میں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور پھر کوشش۔ کوشش۔ اور کوشش۔

258 زیادہ وقت دراصل کل فوری

زینب کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ویسے تو مشکل نہ تھا۔ (تخلی) لحاظ سے وہ صرف میٹرک پاس تھی لیکن بے حد سلیجی ہوئی اور ذہین لڑکی تھی۔ مذہبی رنگ اس کی فطرت و عادات میں نمایاں تھا۔ پنج وقتہ نماز، تلاوت قرآن پاک نے اس کے چہرے پہ نور پھیلا رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گھریلو امور میں طاق اور اخذن کے لحاظ سے بھی بے مثل تھی۔ یقیناً وہ ایک ایسی بیوی تھی جس کے ساتھ کی تمنا ہر انسان کر سکتا ہے اور اس کا ساتھ یا کے شکر ادا کر سکتا ہے۔ میں بھی خوش تھا، مطمئن تھا مگر صرف اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر۔ باہر نکلتے ہی وہ زینب جو مجھے گھر میں کسی نعمت سے کم نہیں لگتی تھی، زحمت لگنے لگتی۔ لوگوں کے رہنما کس۔

”وہ دیکھو واٹ آپل۔“

”اللہ ملائی جوڑی ایک بونا اک بونی۔“

”ماما! دیکھیں لٹل مین اینڈ لٹل لیڈی۔“

”واؤ! گریا اور گڈے کا پیٹو لگ رہا ہے۔“

تب میرا دل چاہتا اس کے ساتھ ساتھ خود بھی کسی جگہ مقید ہو کے رہ جاؤں۔ جہاں کسی کی نظریں ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلنے سے ہر ممکن احتراز کیا کرتا تھا مگر ان پانچ ماہ میں کتنی ہی بار مجبوراً کبھی لکھن پڑا بھی تو لوگوں کے اس رد عمل کے نتیجے میں میں ہمیشہ جلتا بھشتا ہی گھر آیا۔ کئی کئی دن اس سے بلاوجہ اکھڑا کرتا رہتا۔ وہ حیرانی سے میرے بدلتے رویے کو دیکھتی اور میں حیرانی سے اس کی بے بسی ملاحظہ کرتا۔ شاید یہ سب باتیں اس کی سماعت تک پہنچتی نہ تھیں یا شاید وہ اتنی بے حس تھی کہ اپنا مذاق بننا بھی اس پہ اثر نہ کرتا تھا۔



اور یہ ہے میری عمر کا تیسواں سال۔

میری عمر کا تیسواں سال شروع ہوا اور میری شادی کے پہلے پانچ مہینے تمام ہوئے۔ زینب کے ساتھ اس

نئی زندگی کے آغاز میں بلاشبہ کئی بار میرے قدم ڈگمگائے، کئی بار میرا حوصلہ لڑکھڑایا لیکن کبھی سالانہ باہمی کی نصیحتیں، کبھی خدیجہ باجی کی پیار بھری جھڑکیاں، کبھی ابو جی کی وہ پرانی باتیں اور کبھی خود زندگی کی معصومیت اور اچھائی مجھے سنبھال لیا کرتی لیکن زندگی باہر بعد ملنے والا یہ جھٹکا سب سے شدید تھا۔

”آپ کی بیوی امید سے ہے۔“

لیڈی ڈاکٹر کے یہ الفاظ میرے لیے قطعی غیر متوقع تھے۔

یہ ایسی انہونی تو نہ تھی۔

ہماری شادی کو نصف سال گزرنے والا تھا اور ایسا بہر حال جلد یا بدیر ہونا ہی تھا، لیکن اس کے باوجود میں حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔

میرا خیال ہے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں۔ میں

سہام رضا۔ چار فٹ ڈیڑھ انچ کے قد اور تیس سال کی

عمر میں محض اڑتالیس کلو وزن رکھنے والا ایک موٹا

زینب سہام رضا۔ تین فٹ نو انچ کے قد اور اکیس

سال کی عمر میں صرف چھبیس کلو وزن رکھنے والی ایک

عورت۔ یعنی جسمانی لحاظ سے ایک ابارمل مرد اور

عورت اگر کسی بچے کو جنم دینے والے ہیں تو اس بات

کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ بچہ نارمل ہی ہوگا۔ ہاں یا باپ

میں سے اگر کسی ایک کے جینز میں بھی ابارملی

موجود ہو تو ففٹی پرمینٹ چانسز ہوتے ہیں کہ ہونے

والے بچے میں وہ ابارملی منتقل ہو سکتی ہے جبکہ ہم

دونوں میاں بیوی ہی۔

اس خبر کو سنتے ہی یہ پہلا خیال تھا جو میرے دل میں

آیا اور یہ پہلا خیال ہی اتنا روح فرسا تھا کہ اس نے اس

خبر پہ مجھے ڈھنگ سے خوش تک نہ ہونے دیا۔ میں

باپ بننے جا رہا تھا یہ تصور ہی کتنا خوش کن ہو سکتا ہے

لیکن میری کمزوریاں مجھے یہ خوشی منانے سے روک

رہی تھیں۔

نہیں میں باپ نہیں بننے والا۔ میں۔ میں تو

ایک اور سزا پانے پانے والا ہوں۔ میں کچھ تخلیق نہیں

”ہائے تو کیا میں کہوں گی۔ نہیں نہیں مجھے تو بہت شرم آئے گی۔ ان سے میں کہے یہ بات کہہ پاؤں گی۔ اچھا ایسا کرتے ہیں آپ کل مجھے امی کی طرف چھوڑ آئیں۔ میں بھابھی سے بات کر لوں گی ان سے کہنے میں مجھے زیادہ پر اہم نہیں ہوگی۔ وہ امی کو بتادیں گی اور امی خود ہی صالحہ باجی اور خدیجہ باجی کو۔“

”نہیں زینب!“ میں اس کی بات کا ثنا تیزی سے اٹھ کے بیٹھ گیا۔
 ”تم ان سے بھی کچھ نہیں کہو گی۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔
 ”تم کسی سے کچھ بھی نہیں کہو گی۔ سنا تم نے کچھ بھی نہیں۔“
 ”لیکن۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔

”بس میں نے کہہ دیا کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ نہ ابھی نہ پھر کبھی۔“
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسی باتیں بھلا کب چھپتی ہیں اور۔۔۔ اور مجھے سمجھ نہیں آتا، ہم یہ بات چھپا میں گے کیوں؟ خوشی میں اپنے ہی شریک نہ ہوں تو کیا فائدہ؟“

”خوشی۔۔۔؟ کیسی خوشی؟ تم ہانگل ہو زینب اتنی خود غرض نہ بنو۔ اپنی خوشی میں مگن ہو کے یہ بات فراموش نہ کرو کہ تم کیا ہو۔ اٹھو۔ یہ دیکھو گیا ہو تم۔؟“ بے حد اشتعال کے ساتھ میں نے اسے بازو سے تھام کے آئینے کے سامنے کھڑا کیا۔ میرا جارحانہ رویہ اس کے لیے بالکل نئی چیز تھا۔ وہ سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔

”یہ ہو تم اور یہ میں ہوں تمہارا شوہر۔ غور سے دیکھو۔ کیا یہ عورت اور یہ مرد ایک صحت مند اور نارمل بچہ پیدا کر سکتے ہیں؟ جواب دو زینب۔“ میں نے اسے تقریباً ”جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کا کچھ منٹ پہلے خوشی سے گلنار ہوتا چہرہ اب لمٹنے کی مانند سفید تھا۔ وہ خدشہ جو اس خبر کو سنتے ہی میرے دل و دماغ میں کندلی مار کے بیٹھ گیا تھا اب اس کی سوجھوں میں بھی سرسرا نے لگا۔

کرنے جا رہا میں ایک نوزائیدہ وجود کو اپنے اہنار مل جینز دراشت میں دیتے ہوئے اسے مسح کرنے جا رہا ہوں۔ میں ایک نیارشتہ نہیں ایک نیا مذاق بنانے والا ہوں۔ وہ سخا وجود ہماری زندگی میں نہیں ہماری شرمندگیوں میں شامل ہونے آ رہا ہے۔ اپنے حصے کی شرمساریاں سمیٹنے۔

ان سب سوجھوں اور اندیشوں سے یکسر بے نیاز زینب بے انتہا خوش نظر آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ڈاکٹر نے اسے دونوں جہاں کی خوشیوں کی نوید سنا دی ہو اندر لہنی پہچان آمیز مسرت کی وجہ سے اس کا گندی چہرہ تھمرا رہا تھا۔ اس کے لبوں کی لرزش بے حد نمایاں تھی۔ گھر آنے کے بعد اس نے محبوب نظروں سے ہٹنے کی طرف دیکھا مگر میرے پتھر لے تاثرات دیکھ کے ٹکٹی۔

”پتہ ہے میں پہلے ہی جانتی تھی۔“ اس نے پلکیں جھکاتے ہوئے انگلیاں مسلتے ہوئے حیا سے بو جھل داز کے ساتھ کہا۔

”لیکن مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں یہ محض میری خوش نہیں نہ ہو۔ میں بھلا ایسی خوش نصیب۔۔۔ لیکن شکر ہے اللہ نے ہمیں اس خوشی سے نوازا۔“ میرے جذبات سے بے نیاز وہ مسلسل اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ میں نے خود کو بیڑیہ اونڈھا کر لیا۔
 ”کجج تہا میں“ آپ کو امید تھی؟ میرا مطلب ہے ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے آپ کو اندازہ تھا؟“ اس نے شرارتے ہوئے سوال کیا۔ کافی دیر چپ رہنے کے بعد میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”بھی آپ اتنے حیران ہیں۔“ اس نے میری خاموشی کی وجہ دریافت کی۔
 ”اب سب سے پہلے صالحہ باجی کو فون کر کے یہ خوشخبری سناتے ہیں۔ ایشیے نا، وہ کتنی خوش ہوں گے۔“ اس نے میرا شانہ ہلا کے کہا۔ میں نے آہستگی سے کوشل۔

”میں میں نہیں فون نہیں کروں گا زینب!“

”آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“ اچانک اس ہراس سے باہر آتے ہوئے وہ سلک اٹھی۔ ”ابھی ابھی ہمیں یہ خوشخبری ملی ہے اور آپ ایسی بدشگونی کی باتیں کر رہے ہیں۔“

”بدشگونی وغیرہ بکو اس باتیں ہیں۔ حقیقت پسند بنو اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری اگر کوئی اولاد ہوگی تو وہ ہمارے جیسی ہی ہوگی۔“

”میں نہیں مانتی یہ محض آپ کا وہم بھی ہو سکتا ہے اور بالفرض یہ حقیقت ہے بھی تو حقیقت تسلیم کرنے کے لیے ہی ہوتی ہے اسے بدلنا ہمارے اختیار میں نہیں۔ صرف حقیقت پسند بننے سے کیا ہوگا حقیقت کو قبول کرنا بھی سیکھے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ کہ اب جو بھی ہے سو ہے۔“ وہ مجھے سمجھانے میں ناکامی محسوس کرتے ہوئے بڑی لاچار سی لگ رہی تھی۔ ”کیا کیا جاسکتا ہے ہم قسمت سے لڑتے نہیں سکتے۔ اگر ہمارا بچہ۔“

”کیا کیا جاسکتا ہے؟ یعنی تمہارے خیال میں جو ہونے جا رہا ہے میں اسے ہونے دوں۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ وہ زرد پڑ گئی۔

”ہمیں یہ بچہ نہیں چاہیے زینب۔“

”آپ جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ اس کے لبوں نے نا محسوس سی حرکت کی۔ اگر میں اس وقت اس کے بالکل نزدیک نہ بیٹھا ہوتا تو ہرگز نہ سن پاتا۔

”ہاں اور میں مشکل سے ہی مگر بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کر پایا ہوں۔“ اس کی دلی کیفیت کا اندازہ کر کے میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور ہولے سے سہلانے لگا مگر اس نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ واپس کھینچ لیے اور وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”فیصلہ؟ آپ ہوتے کون ہیں یہ فیصلہ کرنے

والے۔؟“ وہ چلائی۔ ان پانچ ماہ میں بااثرہ سانس پہلی بار اس کی اتنی بلند آواز سنی تھی۔

”اور تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ کرنے والی۔“ اس کے چلانے نے مجھے بھی غصہ آگیا۔

”تم کیلی اس بچے کو پیدا کرنے اور پالنے کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔“

”اور آپ بھی اکیلے اس بچے کو زندگی سے محروم کرنے کا سفاک فیصلہ نہیں سنا سکتے۔ بلکہ آپ تو یہاں

میں بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔ ہماری بساط ہی کیا ہے جو ہم ایک ایسی زندگی کو سانس لینے سے روکیں جو عمر

الٹی سے وجود میں آرہی ہے۔ یہ گناہ ہے اور پھر اپنی ہی اولاد کو۔ آپ کا دل نہیں کانپا یہ بات کہتے ہوئے

آپ کے دل میں محبت کا کوئی جذبہ۔“

”میرا دل کانپتا ہے زینب! مگر یہ سوچ کر کہ وہ سب تکلیفیں اس کی زندگی کا بھی حصہ بنیں گی جو میں نے

سہیں۔ وہ سب ٹھو کریں اس کا بھی مقدر ہوں گی جو میرا ہے۔ میرے دل میں محبت ہے زینب! اور یہی

محبت مجھے اکسار ہی ہے کہ میں اسے ان تکلیفوں سے بچاؤں۔ اس کی قسمت میں یہ سب نہ آنے دوں۔“

”نہ آپ نے اپنی قسمت بتائی تھی اور نہ آپ کی اور کی قسمت بتانے پہ قادر ہیں اور مجھے سمجھ میں نہیں

آتا آپ کن تکلیفوں، کن ٹھوکروں اور کن تلخیوں کی بات کر رہے ہیں۔ کیا ہے جو آپ کو نہیں ملا؟“

”تم کیا جانو زینب! خاندان میں ہر گلی محلے سے لے کر اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک مجھے ہمیشہ حقارت کا

سامنا کرنا پڑا۔ مجھے کسی نے دوستی کے لائق نہیں جانا۔ کبھی مجھے میری ذہانت اور لیاقت کی وجہ سے نمایاں

نہیں ہونے دیا گیا اس لیے کہ میری ذات کی سب سے نمایاں چیز تو میرا قد تھا۔ جو اتنا مختصر اور اتنا کم ہونے کے

باوجود اس قدر اہم تھا کہ میری ہر خوبی چھاجاتا تھا۔ تمہیں کیا پتہ کن حالات میں میں نے تعلیم مکمل کی۔ اور اس کا بھی مجھے کیا فائدہ ہوا۔ کی تو میں نے دکانداری

ہی۔ ابوجی کا خواب میں چاہنے کے باوجود پورا نہ کر سکا۔“

جو انہوں نے گناہ کا کھنڈا بننے کا گناہ کر کے گا کر دیکھ کر وہ جہ سے کھڑا رہا۔ ”میں محسوس کرتا ہوں اور اس کے لیے کہ تمہاری جہ میں بھی بوجہ بننے سے انکار جانے سے انکار باندھے میٹرک پڑھنے پہ تیار نہ تھا کہ پڑھ لکھ جی ہی کے کہنے اس علم کے حصہ پائی۔ اور تبھی ہوئی۔ میں نے چھوڑ دیا اب میں کوشش کرنے ایک دینی وفد ہی صالح والدین کی کی مجھے حافظ قرآن جس کی امید بھی ہاں بننے کی نوید نہیں ہوتی؟ یا اسے نہیں ہاں تو پھر میں میری زندگی مکمل کی۔“ تم جو بھی کہو تمہاری کئی باتیں درر کو خوش نصیب تک نہیں لے سکتا۔“ قائل ہوتے دل کو

”میں دیکھتی ہوں آپ یہ فیصلہ کیسے لیتے ہیں بدلتے۔“ وہ ہتھیالیوں کی پشت سے بستے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کی اس فضول ضد کے آگے ڈٹ کے کھڑے ہونے کے لیے اگر میری بہت کم پڑی تو میں مدد کے لیے پکارنے سے گریز نہیں کروں گی۔“ وہ جیسے وارننگ دیتی کمرے سے نکل گئی۔

اگلے دو دن تک ہمارے درمیان بات چیت برائے نام رہی۔ بلکہ جو تھوڑی بہت ہوئی بھی وہ میری ہی جانب سے تھی، وہ چٹان کی طرح مضبوطی سے جمی کھڑی تھی۔ ایسا نہ تھا کہ میں نرم پڑ رہا تھا بلکہ میں اسے دھیرج اور شانتی سے آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے دن مجھے احساس ہوا کہ وہ اس خود ساختہ ناراضی کو اپنے لیے ڈھال کی طرح استعمال کر رہی ہے۔ یوں تو وقت نکلتا جائے گا۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں اس سے کہا۔

”بہت ہو گیا زینب! بہت ٹسو سے بہا لیے تم نے تم کیا سمجھتی ہو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ یا یہ سب میں کسی شوق کے مارے، اپنے دل کی خوشی پوری کرنے کے لیے کر رہا ہوں۔ یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔ زیادہ دیر کر کے وقت ضائع مت کرو۔ میں ڈاکٹر سے ٹائم لے لیتا ہوں۔ تم تیار۔“

”بس کیجئے۔“ وہ تڑپ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ یہ طے کرنے کا حق آپ کو کسی نے نہیں دیا کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔ اللہ ہمارے لیے جو ٹھیک سمجھتا ہے وہی کرتا ہے۔“

”تو یہی سمجھ لو کہ اللہ کی مرضی بھی اس میں ہوگی۔“

”ستر ماؤں سے بربھ کے چاہنے والا اللہ اگر اس زندگی کو لارہا ہے تو وہ اس کی قسمت بھی لکھ چکا ہوگا۔ جسے بدلنے کا اختیار آپ کو نہیں۔“ وہ کمرے سے نکل گئی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی اتنی کڑوی کسبلی باتیں سننے کے بعد بھی مجھے غصہ نہیں آرہا

جو انہوں نے دیکھ رکھا تھا کہ ان کا اکلوتا بیٹا کوئی اعلا افسر بنے گا، ڈاکٹر، وکیل یا انجینئر بن کے ان کا نام روشن کرے گا مگر میں کیا کرتا، ہر پوسٹ کے لیے مجھے میرے زندگی وجہ سے نا اہل قرار دے دیا جاتا۔ میں وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔“

”میں محسوس کر سکتی ہوں۔“ اس کا طیش بھی ذرا کم ہوا اور اس نے آستلی سے کہا۔

اس لیے کہ تقریباً مجھے بھی یہ سب کچھ سہنا کر اٹھنا تھا۔ میں بھی یونہی کڑھا کرتی تھی۔ میں نے بھی اسکول جانے سے انکار کر دیا تھا۔ ابا جی کے کہنے پر مارے ہاتھ میٹرک کا امتحان پرائیویٹ طور پر دیا مگر آگے پڑھنے پر تیار نہ ہوئی، گھر بیٹھ کے بھی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ پڑھ لکھ کے مجھ میں کون سا فرق آجائے گا۔ پھر ابا جی ہی کے کہنے پر میں نے قرآن حفظ کرنا شروع کیا۔ اس علم کے حصول سے انکار کرنے کی جرات میں نہ کر پائی۔ اور تبھی میرے خیالات میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ میں نے اپنی ذات کی ان خامیوں پر جلنا کڑھنا چھوڑ دیا، اب میں ان ہزار نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرنے لگی جو خدا نے مجھے دی تھیں۔ مجھے ایک دینی وفد ہی گھرانے میں پیدا کیا، مجھے نیک اور صالح والدین کی اولاد بنایا جنہوں نے میری اعلا تربیت کی، مجھے حافظہ قرآن بننے کی سعادت عطا فرمائی اور وہ دیا جس کی امید بھی کسی کو نہ تھی، آپ جیسا شوہر اور اب ہمارے بننے کی نوید۔ کیا ایک مکمل عورت کی یہی زندگی نہیں ہوتی؟ یا اسے کچھ اور بھی چاہیے ہوتا ہے؟ نہیں میں تو پھر میں مکمل عورت کیوں نہیں ہوں اور میری زندگی مکمل کیوں نہیں۔“

”تم جو بھی کموزینب! میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ تمہاری کئی باتیں درست سی۔ چلو تم کہتی ہو تو میں خود بخوش نصیب تک ماننے پر تیار ہوں مگر میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔“ اس کی باتوں پر دھیرے دھیرے قائل ہوتے دل کو میں نے پھر سے آنے والے وقت کی سنجیدگی سے ڈرایا اور اپنے فیصلے پر ڈھٹائی سے جما دیا۔

تھا۔ مجھے تو رونا آ رہا تھا۔ میں پپ چاپ کمرے میں
اندھیرا کیے اپنے بستر میں دبا کر رہا۔

اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ
کسی کو مدد کے لیے پکارنے سے بھی گریز نہیں کرے
گی۔ اگلے دو گھنٹوں میں اس نے اپنی اس دھمکی پہ بھی
عمل کر ڈالا۔ سب سے پہلے صالحہ باجی کا فون آیا۔

”مبارک ہو بھئی“ میرا راجا بھیا اب پایا بننے والا
ہے۔ ”ان کی مبارک باد دیتی آواز میں خوشی اور جوش
اتنا نمایاں نہ تھا جتنا کہ دبا دبا غصہ چھلک رہا تھا۔ میں
بھانپ گیا کہ زینب انہیں سارے معاملے سے آگاہ
کر چکی ہے اور وہ صرف مجھے ٹٹولنے کی غرض سے تمہید
باندھ رہی ہیں۔ ان کی مبارک باد کے جواب میں میں
نے چپ سا دھمے رکھی۔

”کیا ہوا“ کیا خوشی کے مارے آواز تک نہیں نکل
رہی۔ ”اب ان کی آواز میں طنز بھی شامل ہو گیا۔

”جب آپ کو زینب نے ساری بات بتا ہی دی ہے
باجی! تو یوں بھگو بھگو کے مارنے کی کیا ضرورت ہے کہ
ڈالے سب کچھ“ جتنی صلواتیں سنائی ہیں، سنا
ڈالیے۔ ”ان کی طبیعت اور مزاج سے اچھی طرح
واقف ہونے کی وجہ سے میں نے خود کو ہر قسم کی بری
بھلی سننے کے لیے تیار کیا۔

”میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی تھی۔“ کچھ
ٹانپے کے بعد ان کی آواز سنائی دی، جواب بالکل سپاٹ
اور بے تاثر تھی۔

”ہوں تو مند ہی تانس۔ زینب لاکھ اچھی سہی ماں
جائی تو نہیں بھابھی ہے۔ جب اس نے روتے بلکتے یہ
بات مجھے بتائی تو میں نے اس کا ذرا یقین نہ کیا، لٹا اسے
ڈانٹا کہ میرے رضا کے بارے میں ایسا اس نے کہا ہی
کیوں؟ وہ کیا پاگل ہے، نفسیاتی مریض ہے جو ایسی بات
کہنے لگا۔ کتنے اعتماد سے میں نے اسے جھٹلایا۔“ ان کی
بات پہ میں شرمندہ ہو گیا۔

”رضا! کیوں کہا تم نے یہ؟“
”باجی! میں۔“ میں نے طریقے سے انہیں اپنے

خدا شات سے منتھرا آگاہ کیا۔

”رضا! میں اتنی بڑھی تھی تو نہیں لیکن پھر بھی
تمہاری بات سمجھ گئی ہوں۔ لیکن شہ ایک بات بتاؤ
اگر واقعی اواد بقول تمہارے ماں باپ سے رشتہ میں
سب کچھ لے کے پیدا ہوتی ہے تو پھر تم ابو تکی جیسے
تو مند اور سرور قدب ای کے جیسے سمن و سفید کیوں
نہیں تھے؟ ہماری نسل میں واوا پر واوا سارے
نخعیال میں یہ مرض کہیں نہیں تھا۔ پھر تم نے کہاں
سے لیا؟ کیا اس سوال کا جواب ہے تمہاری سائنس
کے پاس۔ دیکھو رضا اگر صحت مند اور نارمل ماں باپ
کے ہاں ایسی اولاد پیدا ہو سکتی ہے جو ذرا سا جسمانی عیب
رکھتی ہو تو پھر کمزور ماں باپ صحت مند اور تندرست
اولاد کیوں نہیں پیدا کر سکتے؟“

خلاف توقع انہوں نے ڈانٹا نہ جھنڑ کا بلکہ ایک واضح
سوال چھوڑ کے فون بند کر دیا۔ ابھی میں اس کا جواب
ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ خدیجہ باجی آگئیں۔ ان کی آنکھیں
متورم تھیں جیسے راستے بھر روتی رہی ہوں۔

”لے جیا“ بے شرم۔ ”کمرے میں آتے ہی وہ
شروع ہو گئیں۔ وہ سب جو سننے کی توقع میں صالحہ باجی
سے کر رہا تھا ان کا آغاز انہوں نے کر دیا۔

”نا شکر ا کہیں کا۔ کہتا ہے مجھے یہ اولاد نہیں
چاہیے۔ ارے کچھ نہیں چاہیے تو اس بد نصیب کو
کیوں ستاتا ہے، کیوں اسے مجبور کر رہا ہے۔ جا جا کر
اللہ سے گلہ کر۔ اولاد تو تجھے اسی کی ذات دے رہی
ہے۔ جا جا کر کہہ دے کہ کچھ یہ رحمت نہیں
چاہیے۔ تو دنیا کا واحد شخص ہو گا جو خود اللہ کو اس کی
رحمت و برکت واپس لوٹائے گا۔“

”آپ میری پوری بات تو سنیں۔“ میں ان کی
حالت سے گھبرا گیا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔

”مجھے نہیں سننی یہ کلیجہ جلانے والی باتیں۔ ارے
میرے تو تب سے آگ لگی ہے، ہم پاگل تھے جو تجھ
سے اتنے سالوں سے محبت کرتے آ رہے ہیں۔ میری
ماں دیوانی تھی جو مرتے وقت تک روز رات کو تیرا ماتھا

”زیلے ہی جیسے ابو جہل اور انی کے
تھیلی کا پھلا بنا کر۔ اللہ کے حضور گمراہی اور
کے۔ ویسے ہی میں بھی پاؤں گی۔“

اور یہ میری زندگی کا پہلا سال ہے۔
وہ پہلا سال، جس میں میں ہر طرح کے وابستے،
خوف، احساس کمتری اور کم مائیگی کے احساس سے آزاد
ہوں۔

وہ پہلا سال جس میں میں خود کو خوش نصیب
محسوس کر رہا ہوں کہ کیونکہ آج اللہ مجھے اپنی رحمت
سے نوازنے والا ہے۔ زینب اندر لبروم میں ہے۔
باہر میں خدیجہ باجی کاظمہ اور میری ساس منتظر ہیں۔
ڈاکٹر نے پہلے ہی بتا رکھا ہے کہ جڑواں بچے ہیں میں
نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ دونوں میں سے ایک بچہ
میں خدیجہ باجی کی سولی گود میں ڈال دوں گا۔ زینب نے
میرے فیصلے کی بھرپور تائید کی تھی۔

اور ایسا نہیں ہے کہ یہ فیصلہ میں نے خدیجہ باجی کی
اس بات کو سن کر کیا تھا کہ ”خدا نخواستہ اگر“ نہیں ہر
گز نہیں۔ اب میرے خیالات میں کسی
”خدا نخواستہ“ کا ذکر نہیں مجھے اللہ کی رحمت سے پوری
امید ہے۔ اور یہ امیدیں اپنے بے شمار دنوں میں بے
شمار خواب، بن چکی ہیں۔ وہ خواب جو کبھی ابو جی نے
دیکھے تھے وہی خواب آج میری پلکوں پہ سجے ہیں۔
ان خوابوں میں رنگ بھرنے والے ننھے سے وجود کا
میں بے چینی سے منتظر ہوں۔

ابھی کچھ دیر میں وہ ننھی سی قلقاریاں گونجیں گی۔
وہ زندگی سے بھرپور چیخ اعلان کرے گی کہ۔
”دنیا میں جب بھی کوئی نیا وجود جنم لیتا ہے تو وہ اس
بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ ابھی انسان سے مایوس
نہیں ہوا۔“



جو دم کرنے کے بعد سوتی تھی اور میرا باپ وہ تو
سے برساتا تھا جس نے بیٹے کو اپنی بسااہ اور
بیٹیت سے برہہ کے لاڈ و آسائش سے پالا۔ اولاد کی
مبت اور اس کی آزمائش سے ڈر رہا ہے۔ کم عقل
انسان یہ آزمائش بھی قسمت والوں کو نصیب ہوتی
ہے۔ تجھے میری خالی گود نظر نہیں آتی۔ تجھے میری
پرانی نظر نہیں آتی۔ میرے جیسے کتنے ہیں جو راتیں
جاگ جاگ کے دعا میں مانگتے ہیں، سجدے میں روتے
بلکتے ہیں مگر۔ اور تجھے بن مانگے نعمت مل رہی ہے
اس لیے ناشکر ابن رہا ہے۔“

میرا سر جھک گیا۔ بے دریغ شرمندگی نے مجھے
کسی سے آنکھ ملانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ جب میں
نے یہ جذباتی فیصلہ کیا تھا تب بھی مجھے اندازہ تھا کہ یہ
فیصلہ کسی کے لیے بھی آسانی سے قابل قبول نہ ہوگا۔
سب ہی برہہ چڑھ کے مخالفت کریں گے لیکن اس کے
باوجود مجھے یقین تھا کہ میں سب کو اپنے پر زور دلائل
کے ذریعے قابل کر لوں گا۔ اور ہوا کیا میں خود ہی۔

”اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ تو ایسا کیوں
سوچتا ہے۔ یہ بھی تو سوچ سکتا ہے اللہ تیری محرومیوں
سے ازالے کے لیے تجھے اولاد دے رہا ہے۔ جو خواب
ابو جی تیرے حوالے سے پورے نہیں کر پائے، انہیں
مکمل کرنے ”وہ“ آ رہا ہے۔ اگر کوئی اندیشہ ہے بھی تو
دعا مانگ میرے بھائی، اللہ سے رحم مانگ، اس کا کرم
طلب کر۔ تیرے اکیلے کے ہاتھ نہیں، زینب اور ہم
چاروں بہنوں کی ہتھولیاں بھی مانگنے کے لیے اٹھیں
گی۔ اور مجھے اللہ سے پوری امید ہے انشاء اللہ میرے
بھائی کے آنگن میں چاند سا جیسے صحت مند بچہ کھیلے
گا۔“ ان کا غصہ شاید میری پسپائی دیکھ کے کم ہو گیا۔

”اور اگر خدا نخواستہ۔ خدا نخواستہ۔ میرے منہ
میں خاک دھول، اگر تیرا کوئی داہمہ سچ بھی نکلا تو ٹھیک
ہے تو خود کو آزمائش میں مت ڈالنا۔ اسے میری تھولی
میں ڈال دینا۔ میں اسے پال لوں گی۔“

”آپسے؟ آپ کیسے؟“